تعارفِ قرآن کریم

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن کے صدر مؤسس محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب حفظہ اللہ نے قرآن اکیڈمی کی جامع مسجد میں رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ کے دورۂ ترجمۂ قرآن کے آغاز میں "تعارفِ قرآن کریم" کے موضوع پر اختصار کے ساتھ خطاب فرمایا تھا' جسے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے۔ واضح رہے کہ اس موضوع پر محترم ڈاکٹر صاحب کے ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے کے چار خطابات بھی موجود ہیں' جن کے آڈیو اور ویڈیو کیسٹ دستیاب ہیں ---- (ادارہ)

© rasailojaraid.

خطبۂ مسنونہ' ادعیۂ ماثورہ اور موضوع سے متعلق آیات کی تلاوت کے بعد فرمایا کہ میری آج کی گفتگو کا موضوع "تعارفِ قرآن" ہے۔ میں انتہائی اختصار کے ساتھ قرآن کے تعارف کے حوالے سے اہم نکات کی وضاحت پر ہی اکتفا کروں گا۔

قرآن حکیم کے بارے میں ہمارا عقیدہ

عقیدہ کے حوالے سے تین باتیں بہت ہی بنیادی اہمیت کی حامل ہیں' جو ہمارے ذہنوں میں مستحضر رہنی چاہئیں :

(i) یہ اللہ کا کلام ہے۔ میں یہاں لفظ "کلام" پر زور دے رہا ہوں۔

(ii) یہ محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا ہے۔

(iii) یہ ہر اعتبار سے محفوظ ہے۔ یہ مِن وعن اسی حالت میں ہے جیسے کہ نازل ہوا تھا۔ اس میں نہ کوئی تحریف ہوئی ہے' نہ تو کوئی تبدیلی ہوئی ہے۔ یہ تبدیلی نہ تو ترتیب میں واقع

© rasailojaraid.

ہوئی ہے اور نہ ہی اس کے متن میں۔ اس میں ہر چیز' جیسی کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے امت کو عطا فرمائی تھی' اسی حال میں محفوظ ہے' اور یہ تاقیامِ قیامت' بلکہ تاابد محفوظ رہے گا۔ یہ تین چیزیں ہمارے ذہنوں میں اس طرح نقش ہونی چاہئیں جیسے کہ پتھر پر لکیر۔

اب میں ان میں سے ہر ایک کے بارے میں کچھ اختصار کے ساتھ عرض کروں گا۔

(i) قرآن اللہ کا کلام ہے

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے' تو قرآن مجید میں سورۃ توبہ کی آیت نمبر۶ میں یہ لفظ آیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ ﴿ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ﴾ گویا اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید کو قرآن حکیم ہی میں اپنا کلام قرار دیا ہے۔ اب یہاں سے عظمتِ قرآن کا ایک بہت اہم نکتہ واضح ہوتا ہے۔ قرآن کی عظمت کو قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے مختلف پہلوؤں سے واضح کیا ہے۔ پھر نبی اکرم ﷺ نے بھی مختلف پیرایوں میں اس عظمت اور فضیلت کو بیان کیا ہے۔ اس مقام پر خاص اس پہلو سے کہ یہ اللہ کا کلام ہے' اس کی عظمت کا جو ایک رخ ہمارے سامنے آتا ہے' وہ یہ ہے کہ کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے۔ گویا کہ قرآن اللہ کی صفت ہے۔ ہمارے ہاں متکلمین اور فلاسفہ میں اس مسئلے پر بڑی بحث رہی ہے کہ اللہ کی صفت کو اللہ کی ذات پر زائد مانا جائے یا اس کی ذات کا عین مانا جائے۔ جیسے کہ اقبال کے ایک شعر میں ہے۔

ہیں کلامُ اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟

اور ع

ہیں صفاتِ ذاتِ حق' حق سے جدا یا عینِ ذات؟

یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی جو صفات ہیں وہ اس کی ذات سے علیحدہ ہیں یا اس کی عین ہیں؟ اس بات پر متکلمین کا اجماع ہے "لاعَین ولاغَیر"۔ یعنی نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صفاتِ باری

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

تعالیٰ اللہ کی غیر ہیں اور نہ ہی یہ کہ وہ عین ہیں۔ یہ جو باریک سا تعلق ہے اس کو ذہن میں رکھئے کہ قرآن مجید کلام اللہ ہونے کے اعتبار سے ذات باری تعالیٰ سے اس قدر قرب رکھتا ہے کہ ہم اسے اس کا غیر نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے۔ اسی حوالے سے اس کی عظمت واضح ہوتی ہے' جو علامہ اقبال نے ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

یعنی صاف کہہ دوں وہ بات جو میرے دل میں مضمر ہے کہ یہ کتاب نہیں ہے' اسے کتاب نہ سمجھئے بلکہ یہ کچھ اور شے ہے۔ لیکن "کتاب" تو خود قرآن اپنے آپ کو کہتا ہے۔ ﴿حٰمٓ ۝ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝﴾ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن حکیم کس اعتبار سے کتاب ہے اور کس اعتبار سے کتاب نہیں ہے۔ اس اہم نکتے کو میں بعد میں واضح کروں گا۔ اس مقام پر جو بات بیان مقصود ہے' وہ بقول اقبال یہ ہے کہ۔

مثلِ حق پنہاں وہم پیداست او
زندہ و پائندہ و گویاست او

چونکہ یہ اللہ کی صفت ہے اس لئے اس میں وہ ساری شانیں موجود ہیں' جو ذاتِ باری تعالیٰ میں موجود ہیں۔ سورۂ حدید میں آتا ہے کہ ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ گویا یہ آیت بھی اسی بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات ظاہر بھی ہے اور باطن یعنی مخفی بھی ہے' اسی طرح قرآن ظاہر بھی ہے اور چھپا ہوا بھی ہے۔ اور جیسے اللہ کی شان ہے "الحَیُّ القَیُّوم" ایسے ہی یہ قرآن بھی زندہ و پائندہ ہے۔

اس اعتبار سے ایک اور نکتہ جو قرآن مجید سے واضح ہوتا ہے وہ سورۂ اعراف میں بیان ہونے والے واقعہ میں ہے۔ پھر قرآن مجید کے حوالے سے وہی بات سورۂ حشر میں بھی بیان ہوئی ہے۔ سورۂ اعراف میں بیان ہونے والے جس واقعے کا ذکر میں نے کیا ہے' وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور پر گئے جبکہ انہیں تورات دی جانی تھی۔ حضرت موسیٰؑ پہلی دفعہ کوہ طور پر اس وقت گئے تھے جب انہیں نبوت سے سرفراز کیا جانا تھا

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

جب آپؑ مدین سے واپس جا رہے تھے۔ اس واقعہ کے بعد جب ہجرت ہوئی اور آپ تمام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے تو اب کوہ طور پر دوبارہ طلب فرمائے گئے۔ اب وہاں انہیں تورات دی جانی تھی۔ جب حضرت موسیٰؑ مکالمہ و مخاطبۂ الٰہی سے سرفراز ہوئے تو ان کے دل میں ایک شوق بھڑکا کہ یہ پردے کے پیچھے سے گفتگو ہو رہی ہے یعنی "مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ" تو کیوں نہ دیدارِ الٰہی مجھے حاصل ہو جائے۔ چنانچہ قرآن میں آتا ہے کہ آپؑ نے عرض کیا: ﴿رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ﴾ اے اللہ جب مخاطبہ و مکالمہ ہو رہا ہے، تو ذرا دیدار بھی ہو جائے! اے میرے رب میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں!! اللہ کی طرف سے جواب دیا گیا: ﴿لَنْ تَرٰىنِیْ﴾ "تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔" اب حضرت موسیٰؑ کے لئے اس بات کو مزید واضح کرنے کے لئے ایک تجربہ کرایا گیا۔ وہ تجربہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم اپنی ایک تجلی اس پہاڑ پر ڈالیں گے، تم ذرا اس پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر وہ پہاڑ ہماری تجلی کو برداشت کر جائے تو تم سمجھنا کہ تم بھی ہماری تجلی کو برداشت کر جاؤ گے۔ چنانچہ الفاظ آتے ہیں کہ ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ﴾ یعنی جب اللہ نے پہاڑ پر اپنی تجلی ڈالی تو وہ دب گیا اور پھٹ گیا، اور حضرت موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ آپ غور کریں کہ حضرت موسیٰؑ کو بالواسطہ مشاہدہ ہو رہا ہے، براہ راست تجلی حضرت موسیٰؑ پر نازل نہیں ہوئی ہے بلکہ تجلی پہاڑ پر نازل ہوئی ہے اور اسے صرف دیکھنے کا حکم دیا گیا ہے جس کا اثر اس قدر شدید تھا۔ گویا کہ ذاتِ باری تعالیٰ کی تجلی کا تحمل کسی انسان کے لئے ممکن نہیں ہے۔ قرآن کے بارے میں یہی بات ایک تشبیہ کے طور پر سورۂ حشر میں بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ ۚ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ﴾ یعنی اگر ہم نے اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کر دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ دب جاتا اور پھٹ جاتا۔ یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ تدبر کریں، غور و فکر کریں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ تجلیٔ ذاتِ رب اور قرآن مجید کے مابین تاثیر کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ عظمتِ قرآن کا یہ پہلو بھی آپ کے سامنے آجائے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔

© rasailojaraid.com

اللہ کی صفتِ کلام قدیم ہے : اب اس کے ضمن میں دوسری اہم بات یہ سمجھ لیجئے کہ اللہ کا کلام قدیم ہے۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ہے کہ ع ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم!۔ اللہ کی تمام صفات قدیم ہیں۔ اس کی ہر صفت اس کی ذات کے ساتھ ہمیشہ سے قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت کلام حروف و اصوات سے مبرا اور ارفع ہے۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک صفتِ قدیمہ کو ہمارے استفادے اور فائدے کے لئے حروف و اصوات کا جامہ پہنا کر نازل کیا ہے' تاکہ ہم اس کا ادراک کر سکیں۔ اس لئے اس کے بارے میں الفاظ آتے ہیں کہ ﴿اِنَّا جَعَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ۝﴾ یعنی ہم نے اسے قرآن عربی بنا کر اتارا ہے تاکہ تم اسے سمجھ سکو۔ (سورۂ زخرف' آیت نمبر۳)

© rasailojaraid.com

اصل قرآن کیا ہے؟ : تیسری بات یہ سمجھ لیجئے کہ جو اصل قرآن ہے اس کے بارے میں قرآن حکیم میں تین تعبیرات آئی ہیں۔ پہلی تعبیر "لوح محفوظ"۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ ﴿بَلۡ هُوَ قُرۡاٰنٌ مَّجِيۡدٌ فِىۡ لَوۡحٍ مَّحۡفُوۡظٍ﴾ یعنی یہ تو لوح محفوظ میں ہے۔ گویا اصل قرآن وہاں ہے۔ دوسری تعبیر "کتاب مکنون" ہے۔ چنانچہ سورۂ واقعہ میں آتا ہے کہ ﴿اِنَّهٗ لَقُرۡاٰنٌ كَرِيۡمٌ فِىۡ كِتٰبٍ مَّكۡنُوۡنٍ﴾ یعنی یہ تو چھپی ہوئی کتاب کے اندر ہے۔ گویا یہ کتاب جو ہمارے سامنے مصحف کی شکل میں موجود ہے' جسے ہم چھو رہے ہیں' دیکھ رہے ہیں' پڑھ رہے ہیں' یہ قرآن نہیں ہے' اسے مصحف کہتے ہیں۔ قرآن تو "لوحِ محفوظ" میں ہے۔ قرآن تو "کتاب مکنون" میں ہے۔ اس کی جو تیسری تعبیر کی گئی وہ سورۂ زخرف میں ان الفاظ میں آتی ہے کہ ﴿وَاِنَّهٗ فِىۡۤ اُمِّ الۡكِتٰبِ لَدَيۡنَا لَعَلِىٌّ حَكِيۡمٌ﴾ یعنی یہ قرآن تو اس "امّ الکتٰب" میں ہے جو ہمارے پاس ہے۔ اور یہ "علیٌّ حکیم" ہے یعنی بلند و بالا ہے' حکمت والا ہے۔ اصل قرآن وہاں ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ جو ہمارے پاس مصحف ہے اس میں کیا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ اس قرآن کی مصدقہ نقول ہیں' جیسے کہ ہائی کورٹ کا فیصلہ محفوظ ہوتا ہے' اس کی نقلیں آپ جا کے حاصل کرتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

<u>کتاب کسے کہتے ہیں؟</u> : اب ہم "کتاب" پر بحث کریں گے کہ اس کے کیا معنی ہے۔ اس ضمن میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ کتاب کے لفظ کا صحیح صحیح اطلاق تورات پر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ پتھر کی تختیوں پر لکھی ہوئی شکل میں حضرت موسیٰؑ کو ملی تھی۔ وہ الواح لکھی ہوئی کتاب تھیں۔ کتاب کے معنی "لکھنا" کے ہیں۔ اس لحاظ سے قرآن مجید بھی کتاب ہے' اس لئے کہ بعد میں اس کو لکھ بھی لیا گیا ہے۔ اصلاً یہ لکھی ہوئی شکل میں حضرت محمد ﷺ پر نازل نہیں ہوا۔ اسی اعتبار سے تورات کتاب استثناء' باب ۱۸ کی آیات ۱۸۔۱۹ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے خطاب کر کے فرمایا کہ "میں ان کے لئے ان کے بھائیوں ہی میں سے تیرے مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے کہوں گا وہی وہ منہ سے کہے گا"۔ یہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بشارت ہے۔ گویا کہ اللہ کا کلام محمد ﷺ کے منہ میں ڈالا گیا ہے۔ لوگوں تک وہ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے پہنچ رہا ہے۔ اس اعتبار سے تورات میں اور قرآن میں یہ بڑا بنیادی فرق ہے۔ درحقیقت تورات کے اوپر لفظِ کتاب کا اطلاق اس کی اصل کے اعتبار سے صد فی صد ہو رہا ہے۔ قرآن مجید کلامُ اللہ ہے اور بعد میں اسے لکھا بھی گیا ہے۔ اب مصحف کی شکل میں بھی ہمارے پاس موجود ہے' لیکن اصلاً یہ اللہ کا کلام ہے۔ اسی لئے اس قرآن کے لئے آپ نے دیکھا ہو گا قرآن مجید میں الفاظ آئے ہیں کہ ﴿اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ﴾ یعنی اللہ کا جو کلام محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے منہ میں ڈالا گیا' وہاں سے اب وہ قولِ رسولِ کریمؐ کی صورت میں برآمد ہو رہا ہے۔ "رسول کریم" کے الفاظ حضرت جبرائیل اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ دونوں کے لئے ہیں۔

<u>کلامِ الٰہی کی شکلیں</u> : کلام الٰہی کی تین شکلیں ہیں کہ جن کا ذکر سورۂ شوریٰ کے آخری حصے کی آیات میں آیا ہے۔ فرمایا گیا کہ ﴿مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَا یَشَآءُ﴾ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی انسان کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام کرے سوائے تین میں سے ایک صورت کے۔ یا تو بذریعہ وحی' اور وحی سے مراد یہاں براہ راست وحی ہے' وہ چیز

© rasailojaraid.com

جسے ہم "الہام" کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں کوئی بات ڈالے۔ یہی "الہام" جب نبی کو دیا جاتا ہے تو اسی کا نام "وحی" ہوتا ہے۔ یا دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ باہم گفتگو ہوتی ہے لیکن یہ گفتگو "مِن وَرَاءِ حِجَابٍ" اوٹ یا پردے کے پیچھے سے ہوتی ہے' جیسے کہ حضرت موسیٰ سے کوہ طور پر ہوئی اور یہی گفتگو محمدؐ رسول اللہ ﷺ سے معراج کے موقع پر ہوئی۔ "اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّیِّبَاتُ" کے الفاظ حضور ﷺ نے ادا فرمائے اور "اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ" کے الفاظ اللہ کی طرف سے آئے۔ اس کے جواب میں پھر حضور ﷺ نے فرمایا : "اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ"۔ یہ معراج کا مکالمہ ہے جو ہم تشہد میں دہراتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کیا گفتگو ہوئی ہے' ہمیں معلوم نہیں ہے۔ اب تیسری صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتے کو بھیجتا ہے' جو وحی کرتا ہے۔ اس اعتبار سے وحی کی دو قسمیں ہو گئیں۔ ایک وحی بواسطہ فرشتہ جبکہ وحی کی دوسری قسم براہ راست ہوتی ہے۔ اس میں فرشتے کی درمیانی کڑی موجود نہیں ہوتی۔

وحی کی اقسام : اب یہ بات اچھی طرح نوٹ کر لیجئے کہ قرآن مجید صرف تیسری قسم کے کلام پر مشتمل ہے۔ حضور ﷺ کے دل میں اللہ تعالیٰ جو کچھ ڈالتا رہتا تھا وہ "وحی خفی" ہے اور وہ قرآن میں نہیں ہے' حدیث میں ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ بعض احادیث جنہیں ہم کہتے ہیں کہ یہ "حدیثِ قدسی" ہیں جن میں حضورؐ فرماتے ہیں کہ اللہ یوں فرماتا ہے' گویا وہ بھی کلام تو اللہ ہی کا ہے لیکن ہمارے پاس وہ ذخیرۂ احادیثِ نبویہ میں ہیں' قرآن میں شامل نہیں ہیں۔ اسی طریقے سے یہ جو حضورؐ کا شبِ معراج میں اللہ تعالیٰ سے مکالمہ ہوا ہے وہ قرآن میں نہیں ہے۔ گویا یہ بات ثابت ہو گئی کہ قرآن صرف تیسری قسم کی وحی پر مشتمل ہے جسے قرآن ﴿اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَا یَشَاءُ﴾ کے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ اسی لئے فرمایا ﴿نَزَلَ بِہِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ عَلٰی قَلْبِکَ﴾ یعنی قرآن روح الامین (جبرائیلؑ) کے ذریعے سے نازل ہوا ہے آپ کے قلب پر۔ یہ چند باتیں اس وضاحت میں عرض کی گئی ہیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔

© rasailojaraid.com

(ii) قرآن حکیم کا محمد رسول اللہ ﷺ پر نزول

دوسری بات میں نے یہ عرض کی تھی کہ یہ کلام محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا ہے۔ اب نزولِ قرآن کے بارے میں بھی دو باتیں جان لیجئے۔ "نزل - ینزل" یہ ثلاثی مجرد ہے' یعنی کسی شے کا اترنا۔ ایک ہے "اَنزَلَ - یُنزِلُ" "اتارنا۔ یہ "باب افعال" ہے۔ ایک ہے "نَزَّلَ - یُنَزِّلُ" یہ بھی اتارنا ہے۔ یہ باب تفعیل ہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید کے لئے لفظ "نَزَلَ" بھی آیا ہے ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ﴾ لیکن "با" کے اضافے کی وجہ سے اس کے معنی اتارنا ہو گئے ہیں۔ اس لحاظ سے ترجمہ ہو گا کہ "اسے اتارا ہے روح الامین نے" یا "اسے لے کر اترا ہے روح الامین" یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام۔ لیکن اصل میں اس کے لئے جو صیغے استعمال ہوتے ہیں وہ ہیں "اَنزَلَ - یُنزِلُ - اِنزَالًا" باب افعال سے اور "نَزَّلَ - یُنَزِّلُ - تَنزِیلًا" باب تفعیل سے۔ ان دونوں میں بہت فرق ہے۔

باب افعال کا خاصہ یہ ہے کہ کوئی کام دفعتاً ہو جائے' جبکہ باب تفعیل کا خاصہ یہ ہے کہ کوئی کام درجہ بدرجہ' ٹھہر ٹھہر کر' تھوڑا تھوڑا ہو کر' بڑے اہتمام کے ساتھ کچھ مدت میں مکمل ہو۔ مثلاً اعلام کے معنی کسی کو کچھ بتا دینا ہیں جبکہ تعلیم کے معنی ہیں کچھ سکھانا۔ اگر آپ نے کسی کو ایک دم کوئی بات بتا دی تو اب ضروری نہیں کہ اس کی سمجھ میں بھی آ گئی ہو۔ لہٰذا درجہ بدرجہ بات سمجھایئے' ذہن نشین کرایئے' پھر دیکھئے کتنی بات سمجھ میں آ گئی ہے' امتحان لیجئے' پھر اس کے بعد اس کو مزید سمجھایئے۔ اس عمل کا نام تعلیم ہے۔ اب آپ سمجھ لیجئے کہ جو "اعلام" اور "تعلیم" کا فرق ہے وہی "اِنزال" اور "تنزیل" کا بھی ہے۔ اب قرآن مجید میں جہاں رمضان المبارک میں یا لیلۃ القدر میں اتارنے کا بیان ہوتا ہے تو "انزال" کا لفظ آتا ہے۔ چنانچہ الفاظ آتے ہیں کہ ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ﴾ اور ﴿إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾۔ اس کے معنی کیا ہوئے؟ رمضانِ مبارک میں جو وہ لیلۂ مبارکہ ہے یعنی "لیلۃ القدر" اس میں یہ پورا قرآن دفعتاً "جُملةً واحدةً" لوح محفوظ سے اتار کر پہلے آسمان پر پہنچا دیا گیا۔ اب وہاں سے

© rasailojaraid
© rasailojaraid
© rasailojaraid

درجہ بدرجہ تھوڑا تھوڑا کر کے بائیس برس میں جا کر اس کی "تنزیل" مکمل ہوئی۔ تو حضورؐ پر اتارے جانے کے لئے "نَزَّلَ" کا لفظ آیا ہے۔ یہ اتارنا ہے تھوڑا تھوڑا کر کے۔ ﴿نَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا﴾ یعنی ہم نے اسے اتارا ہے آپؐ پر بطریق تنزیل تھوڑا تھوڑا کر کے۔ یہ درحقیقت دونوں الفاظ کا فرق ہے۔ لوح محفوظ سے سماءِ دنیا تک یعنی سب سے نچلے آسمان تک "انزال" ہے۔ اس لئے کہ یہ دفعتاً ہوا، جملۃً واحدۃً ہوا۔ وہاں سے حضرت جبرئیلؑ وقت کے مطابق، ضرورت کے مطابق محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر نازل فرماتے رہے۔ اس کے لئے صیغہ تنزیل کا آتا ہے۔

قرآن کا زمانہ نزول : اب ہم یہ دیکھیں گے کہ قرآن کا زمانہ نزول کیا ہے۔ ہم جس حوالے سے تاریخ کو کچھ یاد رکھتے ہیں وہ سنِ عیسوی ہے۔ اس کے اعتبار سے ۶۱۰ عیسوی میں یہ تنزیل محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر شروع ہوئی اور ۶۳۲ء میں حضورؐ کا انتقال ہو گیا۔ اس لحاظ سے ۲۲ برس شمسی بنتے ہیں۔ ۶۱۰ عیسوی سے ۶۳۲ء کے دوران بائیس (۲۲) برس میں قرآن نازل ہوا۔ سن ہجری کے حساب سے کہیں گے تو عام الفیل کے حساب سے وہاں پر کیلنڈر شروع ہو گیا تھا۔ چالیس عام الفیل میں اس کا نزول شروع ہوا ہے۔ اس لئے کہ عام الفیل ہی میں حضورؐ کی پیدائش ہوئی ہے۔ اصحابِ فیل کا واقعہ بہت مشہور ہے جس میں ابرہہ ہاتھیوں کے ساتھ فوج لے کر کعبہ کو منہدم کرنے کے لئے آیا، عربوں نے وہاں سے اپنا کیلنڈر شروع کیا ہے۔ گویا قرآن کے نزول کا آغاز چالیس عام الفیل میں ہوا ہے۔ ہجرت کے حساب سے اسے بارہ قبلِ ہجرت کہیں گے۔ ہجرت سے بارہ سال پہلے اس کا آغاز ہوا اور سن گیارہ ہجری میں اس کی تکمیل ہو گئی۔ قمری حساب سے یہ تقریباً تئیس (۲۳) برس بنتے ہیں۔ یہ چیزیں ایسی ہیں کہ ان کو ذہن میں رکھنا چاہئے۔

قرآن کا مقام نزول : اس کے ساتھ ہی دوسری عام دلچسپی کی چیز یہ ہے کہ قرآن نازل کہاں ہوا۔ اب اگر آپ کہیں گے عرب میں، تو عرب بہت بڑی جگہ ہے جس میں پورا جزیرہ نمائے عرب شامل ہے۔ یہ بہت بڑا ملک ہے۔ عرب کا ایک علاقہ جس کا نام حجاز ہے، پورا قرآن یہاں پر نازل ہوا ہے۔ حجاز ہی کے یہ شہر ہیں، مکہ بھی، طائف بھی، اسی میں

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

یہ سورۃ البقرہ کی آخری دو آیتیں ہیں ﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ .... ﴾ اور وہ آخری آیت جس میں قرآن مجید کی طویل ترین دعا ہے : ﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِیْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا .... ﴾ مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے یہ روایت موجود ہے کہ یہ دو آیتیں شبِ معراج میں حضور ﷺ کو عطا ہوئی ہیں جبکہ آپ ساتویں آسمان پر سدرۃ المنتہٰی پر تھے‘ اور امت کے لئے تحفے کے طور پر حضورؐ کو دی گئی ہیں۔

(iii) محفوظیتِ قرآن

قرآن حکیم کے بارے میں ہمارے عقیدے کے حوالے سے تیسری بات یہ ہے کہ قرآن کُل کا کُل محفوظ ہے‘ نہ اس میں کوئی کمی بیشی ہوئی ہے‘ نہ تحریف اور نہ ہی تبدیلی ہوئی ہے۔ بقول اقبال ؎

حرفِ اُو را ریب نے‘ تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

اقبال کہتے ہیں کہ یہ قرآن وہ کتاب ہے کہ جس کے نہ کسی حرف میں کوئی تبدیلی یا ترمیم ہوئی ہے اور نہ ہی اس میں کوئی شک والی بات ہے۔ اور اس کی آیات درحقیقت تاویل کی محتاج نہیں ہیں۔ وہ آیات خود اپنی جگہ پر واضح ہیں‘ "بینات" کی حیثیت رکھتی ہیں۔

حفاظتِ قرآن اور اہلِ تشیع : ہمارے ہاں اہل تشیع کی طرف سے قرآن کے محفوظ ہونے کے ضمن میں بڑے شکوک و شبہات لوگوں کے ذہنوں میں پیدا کر دیئے گئے ہیں۔ اہلِ تشیع کا کہنا یہ ہے کہ اصل قرآن تو حضرت علیؓ کے پاس تھا اور وہ ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے تھا۔ وہ اصل قرآن اب ان کے عقیدے کے مطابق ان کے بارھویں امام جو کہ ابھی روپوش ہیں‘ یعنی امام غائب ہیں‘ ان کے پاس ہے۔ وہ جب ظاہر ہوں گے تو وہ اصل قرآن لے کر آئیں گے۔ اگرچہ جب معاملہ عدالتی نوعیت کا ہوتا ہے تو اہل تشیع کا موقف یہ ہوتا ہے کہ ہم بھی اسی قرآن کو مانتے ہیں‘ یہی اصل قرآن ہے‘ یہ محفوظ ہے‘ لیکن آپ ان کی

© rasailojaraid.c

وادیٔ نخلہ بھی ہے' اسی کا شہر مدینہ بھی ہے۔ اور یہی حجاز ہے جو جا کر اوپر شام کی سرحد سے ملتا ہے۔ گویا تبوک اس کی آخری سرحد ہے۔ حضور ﷺ نے اگرچہ آغازِ وحی سے قبل بڑے بیرونی سفر بھی کیے۔ آپؐ شام بھی جاتے تھے' تجارت کے لئے آپ بڑے ممالک میں گئے ہیں' بلکہ ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق کے مطابق حضورؐ سندھ کے ساحل پر بھی تشریف لائے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں پر جو میلے لگتے تھے' تو حضورؐ وحی کے آغاز سے قبل یہاں تشریف لائے تھے۔ تاہم اس کے لئے وہ کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ "الخبر" جہاں پر ہے یعنی مشرقی ساحل پر' یہاں بہت بڑا تجارتی میلہ لگتا تھا۔ وہاں حضورؐ کی آمد قطعی طور پر ثابت ہے۔ اس حوالے سے میں یہ بات بتانا چاہتا ہوں کہ حضورؐ نے اگرچہ وحی کے آغاز سے قبل بہت دور دراز کے سفر بھی کیے ہیں' لیکن وحی کے آغاز سے لے کر آپؐ کے انتقال تک' آپؐ کا سارا وقت حجاز میں ہی گزرا ہے۔ اسی حجاز ہی کے ایک شہر مکے میں آپؐ تھے تو قرآن مجید کا تقریباً دو تہائی حصہ نازل ہو گیا۔ پھر آپ ہجرت کے سفر میں جا رہے تھے تو اس میں کچھ آیات نازل ہو گئیں۔ طائف جا رہے تھے تو اس کے دوران کچھ آیات نازل ہو گئیں۔ پھر جب آپ مدینہ منورہ میں مقیم تھے تو اُس وقت قرآن مجید کی طویل ترین سورتیں نازل ہو گئیں۔ تبوک کے لئے جب تشریف لے جا رہے تھے تب کچھ آیات نازل ہو گئیں۔ اسی طرح مختلف غزوات کے لئے جاتے تھے یا واپس تشریف لاتے تھے تو اس وقت آیات نازل ہوتیں۔ لیکن یہ کہ جغرافیائی اعتبار سے سمجھ لیجئے کہ یہ جزیرہ نمائے عرب کا صرف ایک حصہ ہے۔ یہ شمالاً جنوباً تو کافی لمبا ہے مگر اس کی چوڑائی کم ہے' کہیں پچاس میل ہے تو کہیں تیس میل ہے۔ یہ اصل میں پہاڑی سلسلہ ہے۔ اس سے مغرب کی طرف کا علاقہ "تہامہ" کہلاتا ہے اور اس سے مشرق کی طرف نجد کہلاتا ہے۔ نجد میں حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں فوجی مہمات گئی ہیں لیکن حضورؐ کا جانا ثابت نہیں ہے۔ گویا قرآن حکیم کے لئے ارضِ نزول حجاز ہے اور زمانہ نزول ۶۱۰ء سے لے کر ۶۳۲ء تک ہے۔

البتہ نزول کے اعتبار قرآن کی دو آیتیں مستثنیٰ ہیں۔ یہ دو آیتیں آسمان سے اتر کر زمین پر حضورؐ پر نازل نہیں ہوئیں بلکہ حضورؐ آسمان پر جا کر ان آیات کو لے کر آئے۔

© rasailojaraid.c

امہات الکتب پڑھ کر دیکھئے تو وہاں آپ کو یہ ہفوات بھی مل جائیں گی کہ اتنی آیتیں اس میں سے ختم کر دی گئیں' اتنی سورتیں نکال دی گئیں' اتنا حصہ حضرت علیؓ کی مدح میں تھا' وہ وہاں سے نکال دیا گیا وغیرہ وغیرہ۔ البتہ ایک بات تو بالکل واضح ہے کہ قرآن کی ترتیبِ نزولی اور تھی' ترتیبِ مصحف کچھ اور ہے۔ اس بات میں تو کوئی شک نہیں ہے اور اس بات کو ہم بھی مانتے ہیں۔ چنانچہ اس کے حوالے سے بھی شکوک و شبہات پیدا کر دیئے گئے ہیں۔ اس حوالے سے چند مزید باتیں میں آگے چل کر بیان کروں گا۔

قرآن مجید کی زبان اور اسلوب

اب میں اس بات کی طرف آتا ہوں کہ قرآن مجید کی زبان کونسی ہے۔ اگر آپ کہیں عربی زبان ہے تو عربی زبان کی تو بے شمار صورتیں ہیں۔ عرب کے جزیرہ نما میں عربی زبان کے اتنے لہجے (dialect) تھے کہ ایک دوسرے کی عربی ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ چنانچہ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں ایک وفد آیا تھا اور وہ لوگ آکر جب حضورؐ سے گفتگو کر رہے تھے تو صحابہ کہتے ہیں کہ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ہر زبان میں کئی ایک لہجے ہوتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ پنجابی ایک زبان ہے لیکن پنجابی کے نامعلوم کتنے "dialect" ہیں۔ اسی طرح عربی کے بھی بے شمار لہجے تھے۔ آج کی عربی میں بھی مختلف علاقوں میں فرق پایا جاتا ہے۔ آپ لیبیا کی عربی جا کر سنئے' اسے حجازی نہیں سمجھے گا کہ یہ کیا بول رہے ہیں۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کا عربی زبان پر بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے اُس دور کی عربی کو محفوظ کر دیا ہے' ورنہ ایک دو صدیاں گزرنے پر ہی کسی زبان میں بہت سا تغیر واقع ہو جاتا ہے۔ جبکہ آج بھی فصیح عربی ایک ہی ہے کہ جس میں تصنیف و تحریر کا کام کیا جاتا ہے اور یہ قرآن حکیم کی زبان ہے۔ عالم عرب میں آپ کو فصیح زبان بولنے والے بھی ملیں گے جنہیں فصحاء کہتے ہیں لیکن مقامی زبان تو ہر علاقے کی اپنی ہے۔ یہ معاملہ خود حضورؐ کے زمانے میں بھی تھا۔ اُس وقت بھی بہت سے لہجے تھے۔ اگرچہ قرآن مجید سورۂ زخرف کے آغاز میں کہتا ہے کہ ﴿حٰمٓ ۝ وَالْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ ۝ اِنَّا

© rasailojaraid.com

جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝﴾ سورۂ یوسف میں فرمایا: ﴿الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝﴾ اسی طرح سورۂ زمر میں فرمایا: ﴿قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ﴾ یہ الفاظ مختلف آیات میں آئے ہیں۔ لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ عربی کون سی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حجاز کی عربی۔ پھر یہ کہ حجاز کے بھی شہروں کی عربی نہیں بلکہ حجاز کے دیہات کی۔ حجاز کی بدوی زبان اصل زبان تھی۔ عربوں میں بھی اصل عربی اسے ہی مانا جاتا تھا۔ اس لئے کہ شہروں میں باہر سے بھی لوگ آتے رہتے ہیں تو زبان گڈمڈ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ عرب اپنی زبان کو خالص رکھنے کا بڑا اہتمام کرتے تھے کہ ہمارے بچوں کی زبان خراب نہ ہو جائے۔ اب ظاہر بات ہے کہ مکے میں وفد چلے آ رہے ہیں، تجارتی قافلے چلے آ رہے ہیں، شامی چلے آ رہے ہیں، یمنی چلے آ رہے ہیں، حبشی چلے آ رہے ہیں، تو ظاہر ہے کہ وہاں کی زبان تو بگڑے گی۔ اس لئے عرب اپنے بچوں کو پیدا ہوتے ہی دور دراز صحرائی دیہاتوں میں بھیج دیتے تھے، اس لئے کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارا اصل کلچر اور تہذیب وہاں ہے۔ اس حوالے سے آپ یوں سمجھئے کہ یہ حجاز کے بادیہ نشینوں کی زبان ہے کہ جو قرآن مجید نے اختیار کی ہے۔ مدینے میں بھی آپ کو معلوم ہے کہ یہود آ کر آباد ہو گئے۔ مدینے میں جو دو قبیلے اوس اور خزرج تھے، یہ بھی یمن سے آئے تھے۔ اس اعتبار سے ان کی زبانوں اور لہجوں میں باریک باریک فرق تھا۔ لہٰذا "لِسَانٌ عَرَبِيٌّ" سے مراد حجاز کے بادیہ نشینوں کی عربی ہے۔

البتہ دوسرے مختلف قبائل کے جو لہجے تھے تو قرآن مجید میں کوئی کوئی لفظ ان کا بھی اختیار کیا گیا ہے۔ اسی طرح بعض الفاظ غیر زبان کے بھی قرآن نے لے لئے ہیں۔ وہ الفاظ معرب ہو کر آئے ہیں، جیسے "سِجِّيْل" کا لفظ ہے۔ یہ دراصل "سنگ گِل" ہے اور یہ فارسی کا لفظ ہے اور فارسی ہی کی ترکیب ہے، یعنی یہ کہ جو مٹی کا بنا ہوا پتھر ہوتا ہے۔ صحراؤں میں اس طرح ہوتا ہے کہ اگر بڑی ہلکی سی بوندا باندی ہوئی، ایک ایک قطرہ تھا، تھوڑی سی مٹی کے ساتھ مل کر گارا بن گیا، اب وہ چھوٹی سی گولی بن گئی۔ پھر جب تیز دھوپ پڑی تو گویا کہ اسے بھٹی میں تپا دیا گیا۔ اب کنکر بن گیا۔ کنکر جو ہوتے تھے، درحقیقت یہ اس مٹی کے

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

بنے ہوئے ہوتے تھے۔ وہ چھوٹی چھوٹی سی جو گولیاں تھیں کہ جو سورج کی تپش کی وجہ سے پک کر پختہ ہو جاتی تھیں۔ یہ "سنگِ گِل" تھیں جنہیں قرآن مجید نے "سِجِّیل" کہا ہے۔

فصاحت و بلاغت کی معراج : جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کی معراج ہے تو اس کو بڑے بڑے فصحاءِ عرب نے مانا ہے۔ بڑے بڑے شعراء موجود تھے لیکن سب نے تسلیم کیا کہ یہ زبان ہر نقص اور عیب سے پاک ہے۔ یہ گویا کہ عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کی معراج ہے۔

کیا قرآن میں موسیقی ہے؟ : قرآن کی زبان کے حوالے سے ایک اور بات یہ سمجھ لیجئے کہ یہ ایک موسیقی بھی ہے۔ یہ ایک "Divine Music" ہے' ایک ملکوتی غناء ہے۔ اس کے اندر ایک ردھم ہے' ایک موسیقی ہے اور اس موسیقی کی اپنی تاثیر ہے۔ میں اس چیز کو مانتا ہوں۔ مجھے چونکہ ذاتی تجربہ بھی ہوا ہے۔ یہ بہت پرانی بات ہے۔ غالباً ساٹھ کی دہائی کا بھی ابتدائی زمانہ تھا۔ مجھے قرآن حکیم کی دو سورتوں سے 'معاذاللہ' انقباض سا ہوتا تھا۔ ان میں سے ایک سورۂ رحمٰن ہے۔ میں سوچا کرتا تھا کہ اس میں کیا حور و قصور اور غلمان کا تذکرہ ہو رہا ہے' کھانے پینے کی چیزوں کا ذکر ہے۔ ایک شخص جو نفسیاتی اور شعوری اعتبار سے بلند ہو جائے تو اس کے سامنے ان چیزوں کی لذتیں نہیں رہا کرتیں۔ تو کیا قرآن مجید ان چیزوں کا ذکر کرتا ہے؟ یہی معاملہ سورۂ واقعہ کا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب میں نے قاری محمد خلیل الحصری ؒ کی پڑھی ہوئی سورۂ واقعہ اور سورۂ رحمٰن کی تلاوت سنی تو میں نے محسوس کیا کہ کوئی حجاب سا تھا جو اب اترتا جا رہا ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ ان کے معانی تو پہلے بھی مجھے معلوم تھے' قراءت میں معانی تو بدل نہیں گئے تھے' لیکن ان کے پڑھنے کے انداز کا یہ اثر تھا۔ اب اس کا کوئی تعلق عقل و شعور اور دلیل سے نہیں ہے۔ یہ درحقیقت قرآن کے ملکوتی غناء کی عکاسی ہے۔

یہ بات بھی آپ جان لیجئے کہ قرآن کی ادبیت اور فصاحت و بلاغت کا معاملہ صرف عقیدے کا نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے عرب عیسائی بھی ہیں اور یہودی بھی ہیں۔ یہ جو

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

عیسائی عرب ہیں' اور قرآن پر جن کا ایمان اس اعتبار سے نہیں ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے' وہ محمد ﷺ کو اللہ کے نبی اور رسول نہیں مانتے' لیکن وہ بھی اس حقیقت کو مانتے ہیں کہ عربی ادب کا مقامِ عروج (climax) قرآن ہے۔ یہ اس کی زبان کے بارے میں چند باتیں تھیں۔

قرآن کے اسماء و صفات : علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی معرکۃ الاراء کتاب "الاتقان فی علوم القرآن" میں قرآن کے پچپن (۵۵) نام شمار کئے ہیں' جو قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا ہے کہ ابھی لسٹ مکمل نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کے جو اہم اسماء ہیں جو ہمیں معلوم ہیں وہ "القرآن" "الکتاب" "الذکر" "الھدیٰ" "النور" "الفرقان" "کلام اللہ" اور "الوحی" ہیں۔ چند نام اور بھی ہیں جو قرآن کی صفات ہیں۔ جیسے "الکریم" "الحکیم" "العظیم" "المجید"۔ کہیں پر آ جائے گا کہ "کِتَابٌ کَرِیْمٌ" جیسے کہ قرآن مجید میں سورۂ واقعہ میں الفاظ وارد ہوئے ہیں: "اِنَّہٗ لَقُرْاٰنٌ کَرِیْمٌO فِیْ کِتَابٍ مَّکْنُوْنٍO" تو یہ اس کے مختلف اسماء و صفات ہیں۔

لفظ "قرآن" کے معانی : اس میں سب سے زیادہ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ قرآن کے معنی کیا ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ قرآن کا جو سب سے زیادہ مشہور نام ہے اور جسے ایک طرح سے اسم علم کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے وہ قرآن ہے۔ اور اس کا معاملہ بالکل وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ مشہور نام "اللہ" کا ہے جسے بہت سے لوگ اسم ذات کہتے ہیں۔ جیسے لفظ "اللہ" کے بارے میں یہ فیصلہ نہیں ہو پاتا کہ یہ کس مادے اور کس مصدر سے ہے' اسی طرح سے قرآن کے بارے میں بھی یہ طے نہیں ہو پا رہا کہ اس کا اصل مصدر و مادہ کیا ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ اسم جامد ہے' لہٰذا اس کے اندر کوئی معنی تلاش کرنا غلط ہے۔ جیسے "لاہور" اسم جامد ہے' جو ایک خاص جگہ کے لئے بطور اسم علم استعمال ہوتا ہے۔ اب لفظ "لاہور" کے معنی تلاش کرنا عبث ہے۔ قرآن کا معاملہ بھی اسی طرح کا ہے۔

ایک رائے یہ ہے کہ یہ "قرن" سے بنا ہے۔ "قرن" کہتے ہیں کسی شے کا قریب آنا۔

© rasailojaraid.

دو نہایت سعید اور خوش بخت چیزیں قریب آ جائیں تو اس کو "قران السعدین" کہتے ہیں۔ اسی طریقے سے "قَرَنَ الشَّیءُ بِالشَّیءِ" کوئی شے کسی شے کے ساتھ جڑ گئی' آ کر مل گئی۔ تو یہ "قرن" کا مادہ ہو گیا۔ اسی سے "قرینہ" اور "قرائن" کے الفاظ بھی آئے ہیں' جن کا استعمال اس طرح ہوتا ہے کہ قرائن یہ بتا رہے ہیں' یعنی آس پاس کی چیزوں سے یہ اندازہ ہو رہا ہے۔ ایک دوسری رائے یہ ہے کہ یہ "قرء" سے بنا ہے۔ اور "قرء" کے عربی زبان میں دو معنی آتے ہیں۔ ایک تو وہ معنی ہے کہ جس کو ہم جانتے ہیں یعنی پڑھنا۔ تو گویا کہ جیسے کہ رجحان اور غفران مصدر ہیں لیکن وہ مفعول کے معنی دیتے ہیں' اسی طریقے سے "قرء" سے قرآن بنا ہے' یعنی پڑھی جانے والی شے' اور "قرء" کے دوسرے معنی کسی شے کے جمع کر دینے کے ہیں۔ جیسے "قریۃ" کہتے ہیں کسی گاؤں کو' جہاں لوگ جمع ہو کر رہتے ہیں۔ لوگوں کو جمع کرنے والی جگہ "قریۃ" ہے۔ تو اسی اعتبار سے جب "قرآن" کو جمع کر دیا گیا ہے تو اس نے گویا کہ "قرآن" کی شکل اختیار کر لی۔ لہٰذا اس کے دونوں معنی ہو گئے پڑھی جانے والی شے اور جمع شدہ شے۔ کیونکہ قرآن مجید کی آیات تو نازل ہوئی ہیں بائیس یا تیئس سال میں' مختلف اوقات میں۔ پھر ان کو جمع کیا گیا' ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا گیا اور اس طرح سے قرآن وجود میں آیا۔ تو "قرء" سے لیا جائے تب بھی اور "قرن" سے لیا جائے تب بھی' یا تو اس کے معنی ہوں گے پڑھی جانے والی شے 'قرآن' یا اس کے معنی ہوں گے جمع شدہ شے۔ غالب نے کہا ہے۔

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

تو جیسے جگر لخت لخت جمع ہوتا ہے اسی طریقے سے ان آیات کو لا کر' جوڑ کر جمع کر دیا گیا ہے۔ تو اس معنی میں اسے قرآن کہا جاتا ہے۔

اسلوب کلام : اب چند باتیں اسلوب قرآن کے حوالے سے سمجھ لیجئے۔ پہلی بات نوٹ کر لیجئے جس کو قرآن بڑی سختی کے ساتھ کہتا ہے کہ یہ شعر و شاعری نہیں ہے۔ اس کی نفی تو بہت ہی شدت سے ہوئی ہے۔ سورۂ یٰسین میں آتا ہے کہ ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا

© rasailojaraid
© rasailojaraid

یَنۡۢبَغِیۡ لَہٗ ﴾ یعنی ہم نے نہ اپنے پیغمبر کو شاعری سکھلائی ہے اور نہ یہ ان کے شایانِ شان ہے۔ پھر یہ کہ شعراء کی بحیثیتِ مجموعی مذمت بھی آئی ہے چنانچہ سورۂ شعراء میں فرمایا گیا ہے کہ ﴿ وَالشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الۡغَاوٗنَ ۝ اَلَمۡ تَرَ اَنَّهُمۡ فِیۡ کُلِّ وَادٍ یَّهِیۡمُوۡنَ ۝ وَاَنَّهُمۡ یَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا یَفۡعَلُوۡنَ ۝ ﴾ ان آیات میں واقعہ یہ ہے کہ شعراء کے لئے تو پسینے سے پانی پانی ہو جانے والا مقام ہے۔ شعراء کے بارے میں فرمایا کہ ان کا اتباع کرتے ہیں "غاوٗن" یعنی جو پیچھے پڑے رہتے ہیں' وہ لوگ کہ جو حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ پھر یہ شعراء ہر وادی کے اندر سیر کرتے ہیں۔ ابھی کوئی بہت اعلیٰ بات کہہ رہے ہیں اور پھر شراب و کباب کی بات شروع کر دی۔ جدھر رخ ہو جدھر چاہیں گے نکل جائیں گے' کوئی متعین راستہ ہے ہی نہیں۔ کہاں بڑی عارفانہ باتیں ہو رہی تھیں اور کہاں شراب و کباب کے قصے! تیسری بات شعراء کے بارے میں یہ کہی کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں کرتے نہیں۔ اس لئے کہ شعر میں تاثیر ہوتی ہے مبالغہ سے' مبالغہ نہ ہو تو شعر کے اندر کیا رہ گیا۔ وہ تو پھر نیچرل شاعری رہ جائے گی۔ کہاں مولانا حالیؔ کی نیچرل شاعری اور کہاں میرؔ اور غالبؔ کی شاعری' ان میں تو زمین و آسمان کا فرق ہو جائے گا۔ اس حوالے سے اصل شاعری تو وہ شمار ہوگی جس میں مبالغہ ہے۔ اور اس مبالغے پر خود پورا اترنا بڑا مشکل کام ہے۔ مثلاً اقبالؔ کے اسی شعر کو لیجئے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

اب اس معیار پر پورا اترنا کوئی آسان کام ہے؟ لہٰذا شعر میں عموماً یہی کچھ ہوتا ہے' الا ماشاء اللہ۔ اس آیت میں آگے "اِلَّا" بھی آیا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو ایمان لائیں' عمل صالح کریں۔ تو قرآن نے شعراء کو کچھ نہ کچھ پناہ بھی دے دی ہے' جیسے علامہ اقبال ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی تو یہی کہا ہے جو اوپر بیان ہوا ہے۔ حضور ﷺ کے بارے میں فرمایا "وَمَا عَلَّمۡنٰهُ الشِّعۡرَ" ہم نے انہیں شعر سکھایا ہی نہیں اور "وَمَا یَنۡۢبَغِیۡ لَہٗ" یہ ان کے شایانِ شان ہی نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شعر کہنا کوئی گھٹیا بات ہے جو حضورؐ کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ حضورؐ کو شعر سے مناسبت ہی نہیں تھی۔ یہاں

© rasailojarai
© rasailojarai

تک کہ آپؐ کوئی شعر پڑھنے کی کوشش بھی کرتے تو اس میں غلطی ہو جاتی۔ اس لئے کہ شعر میں ردھم اور قوافی اور وزن کا خیال رکھنا پڑتا ہے جبکہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے وہ شے ہی نہیں دی۔ چنانچہ واقعہ آتا ہے کہ ایک دفعہ آپؐ نے ایک موقع پر ایک شعر پڑھا' حضرت ابو بکرؓ موجود تھے' وہ مسکرانے لگے اور ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی عرض کیا "اِنِّی اَشْهَدُ اَنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰه" میں گواہی دیتا ہوں کہ یقیناً آپؐ اللہ کے رسولؐ ہیں' اس لئے کہ آپؐ نے شعر غلط پڑھا ہے' اس لئے میں گواہی دے رہا ہوں۔ حضرت ابو بکرؓ کے ذہن میں قرآن کا یہ ارشاد موجود تھا کہ ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ﴾ ہم نے ان کو شعر سکھایا ہی نہیں اور یہ ان کے شایان شان بھی نہیں ہے۔

بہرحال پہلی بات تو یہ نوٹ کیجئے کہ قرآن بڑی شدت سے گواہی دیتا ہے کہ یہ شاعری نہیں ہے۔ البتہ ایک بات نوٹ کر لیجئے اور وہ یہ ہے کہ آج کل شاعری کی ایک نئی قسم وجود میں آئی ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ وہ شاعری قرآن مجید سے مستعار لی گئی ہے' اور وہ ہے "آزاد شاعری"۔ اس میں ایک ردھم ہوتا ہے' وزن نہیں ہوتا' قوافی نہیں ہوتے' ردیف نہیں ہوتے۔ اس ردھم کے اعتبار سے ہم اسے شاعری کہہ سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے قرآن مجید سے قریب تر اگر آ سکتی ہے تو وہ آزاد شاعری ہے۔ میں یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ آزاد شاعری کا آغاز کب سے ہوا کیونکہ میں ادب کا طالب علم کبھی نہیں رہا ہوں۔ وہ شاعری جسے ہم جانتے ہیں' اس کے شعر' اس کے اوزان اور اس کی بحریں' یہ بڑے ہی ٹیکنیکل ایشوز ہیں۔ بہرحال آپ کے علم میں ہے کہ یورپ میں زیادہ رواج آزاد شاعری کا ہی ہے۔ وہاں اس کا رواج کب سے ہے' یہ میرے علم میں نہیں ہے۔ یورپ میں آزاد شاعری میں بھی قافیہ و ردیف کا کچھ نہ کچھ خیال رکھا جاتا ہے' چنانچہ ورڈز ورتھ وغیرہ کی شاعری سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ردیف و قافیہ کا کچھ نہ کچھ خیال رکھتے ہیں۔ اس شاعری کے حوالے سے ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ وہ شاعری جو عرب جانتے تھے اور وہ شاعری جس سے کہ ہم عام طور پر متعارف ہیں' قرآن اس اسلوب پر نہیں ہے۔ البتہ آزاد شاعری ہمیں قرآن سے کسی درجے میں مناسبت رکھنے والی اور کوئی مطابقت رکھنے والی شے معلوم ہوتی ہے۔

© rasailojaraid
© rasailojara
© rasailojara

<u>قرآن عام معنی میں کتاب نہیں ہے</u> : اس بات پر پہلے گفتگو ہو چکی ہے کہ "کتاب" کے لفظ کا بتمام و کمال اطلاق تورات پر ہوتا ہے قرآن پر نہیں ہوتا۔ اب ہم کتاب کے عام معانی کے حوالے سے چند باتیں سمجھیں گے۔ قرآن حکیم کو ہم عام معانی میں کتاب نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ کتاب کا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ کتاب کے ابواب ہوں گے، ہر باب میں ایک مضمون مکمل ہو جائے گا۔ اگلے باب میں آپ اسے نہیں دہرائیں گے۔ اگر دہرائیں گے تو وہ کتاب کا عیب شمار ہوگا۔ قرآن میں ہم دیکھتے ہیں کہ قصۂ آدم و ابلیس سات سورتوں، سورۂ بقرہ، سورۂ اعراف، سورۂ حجر، سورۂ بنی اسرائیل، سورۂ کہف، سورۂ طٰہٰ اور سورۂ ص میں بیان ہوا ہے۔ گویا اتنی سورتوں میں آدم و ابلیس کا واقعہ چل رہا ہے۔ ایک عام کتاب کے اعتبار سے تو یہ نقص شمار ہوگا۔ لہٰذا اس معنی میں قرآن کتاب نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ مجموعہ مقالات بھی نہیں ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ کتاب نہیں ہے، مقالات کا مجموعہ بھی نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ میں نے نفی تو کافی چیزوں میں کر دی ہے، اثبات کس چیز میں ہے؟ اصل میں عربوں کے ہاں ادب کے میدان میں دو اصناف بہت معروف تھیں، ایک شعر اور دوسرے خطبہ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عرب خطیب بلا کے ہوتے تھے۔ قرآن حکیم کا اسلوب خطبے کا ہے۔

امام جلال الدین سیوطی نے جاحظ کا ایک قول نقل کیا ہے، جو خود شاعر و ادیب تھے کہ قرآن کریم کو ہم دیوان کہہ سکتے ہیں، ہر سورۃ گویا ایک قصیدہ ہے، ہر آیت گویا ایک بیت یا شعر ہے، جو اشعار میں قوافی ہوتے ہیں وہ آیات کے فواصل ہیں۔ لیکن یہ درحقیقت ایک بے تکی بات ہے۔ قرآن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اسلوب خطبے کا ہے۔

چنانچہ خطبے کے چند اوصاف یہاں بیان کئے جائیں گے۔ خطیب اور اس کے مخاطبین کے درمیان ایک بصری رابطہ ہوتا ہے۔ خطیب ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کر رہا ہوتا ہے کہ اس کی ایک تاثیر ہوتی ہے۔ اس کے حوالے سے ہمیشہ یہ دیکھنا چاہئے کہ قرآن مجید کی کس سورت میں کن سے خطاب ہو رہا ہے۔ جب تک آپ مخاطب معلوم نہیں کریں گے اس کے اصل مفہوم اور معانی تک نہیں پہنچ سکیں گے۔

© rasailojarai

خطبے میں دوسری خوبی یہ ہوتی ہے کہ خطیب کے مخاطبین بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی وہ آپ سے بات کرے گا لیکن غائب کے صیغہ میں کرے گا' کبھی غائب کو حاضر کے صیغہ میں مخاطب کرے گا۔ مثلاً بھٹو صاحب کا دور ہے' خطیب بھٹو صاحب سے ایسے مخاطب ہو رہا ہے جیسے وہ سامنے موجود ہوں لیکن وہاں نہ صدر ایوب صاحب ہیں نہ بھٹو صاحب موجود ہیں۔ البتہ گفتگو اس انداز میں ہوتی ہے کہ گویا وہ یہاں موجود ہیں۔ یعنی کبھی حاضر کو غائب سمجھ کر بات ہوتی اور کبھی غائب کو حاضر سمجھ کر بات ہوتی ہے۔

خطبے میں تیسری بات یہ ہوتی ہے کہ اس میں خطاب کا رخ بدلتا رہتا ہے۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ ابھی کوئی بات ہو رہی تھی بے نظیر کو خطاب کر کے' ابھی جو سامعین سامنے موجود ہیں ان سے گفتگو شروع ہو گئی ہے' بیچ میں قاضی حسین احمد صاحب سے بات کر لی۔ یہ خطبے کا ایک انداز ہوتا ہے۔ یہی انداز آپ کو قرآن میں بھی ملے گا۔ ابھی بات کفار سے ہو رہی تھی اس کے بعد اہل ایمان سے گفتگو شروع ہو گئی تو بیچ میں کہیں منافقین سے روئے سخن بھی آ گیا۔ اسی طرح کہیں مشرکین کی بات ہو رہی تھی' درمیان میں کہیں اہلِ کتاب کا تذکرہ ہو گیا۔ گویا کہ خطبے میں جو تمام اوصاف ہوتے ہیں وہ سارے کے سارے اوصاف آپ کو قرآن مجید میں ملیں گے۔

خطبے کا ایک چوتھا وصف بھی ہے۔ یہ وصف اگرچہ قصیدے میں بھی ہوتا ہے لیکن خطبے میں زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ قصیدے اور غزل میں "مقطع" اور "مطلع" کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ پہلا شعر جاندار ہے تو آدمی پوری غزل پڑھے گا' لیکن اگر پہلا شعر ہی پھسپھسا ہے تو اگلا شعر پڑھنے کی کوشش ہی نہیں کرے گا' لہٰذا مطلع زوردار ہونا چاہئے۔ اسی طرح "مقطع" یعنی جو آخری شعر ہوتا ہے وہ اگر زوردار ہے تو اس سے ایک اچھا اختتامی تاثر (Last Impression) قائم ہو گا' ورنہ نہیں۔ اگر درمیان میں وہ تاثر قائم ہوا بھی تھا تو اب پھسپھسا قسم کا مقطع آ گیا تو سارا تاثر ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح خطیب جب خطبہ شروع کرتا ہے تو اگر آغاز ایسا ہو کہ وہ اپنے سامعین کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لے تب تو لوگ اس کی بات پوری توجہ سے سنیں گے' لیکن اگر خطیب کا انداز شروع ہی میں پھسپھسا ہے' تو سامعین کی دلچسپی آغاز سے ہی نہیں رہے گی۔

© rasailojaraid

اسی طریقے سے تقریر اور خطبہ میں ایک مرکزی خیال ہوتا ہے جس پر کہ خطیب آگے بڑھ رہا ہوتا ہے' لیکن درمیان میں دائیں بائیں' ادھر ادھر کی بات کرتا ہے' کبھی کوئی لطیفہ آگیا تو وہ بھی سنا دیا' کبھی کوئی اور ایسی بات کردی جس سے رونا بھی آگیا' لیکن یہ کہ جو خاص بات وہ کہنا چاہتا ہے وہ اس کو درجہ بدرجہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ذہنوں میں اتارتا چلا جاتا ہے۔ اور آخر میں آکر بڑی جامع بات کہہ کر گفتگو ختم کرتا ہے' جس سے ایک آخری تاثر ذہنوں پر مترتب ہوتا ہے۔ اب جنہوں نے یہ خطبہ سنا ہے وہ کوئی مستقل تاثر لے کر اٹھیں گے۔ یہی سارے اوصاف آپ کو قرآن میں نظر آئیں گے۔ چنانچہ قرآن میں اکثر سورتوں کی ابتدائی آیتیں جن کو ہم فواتحِ سُوَر کہتے ہیں اور اختتامی آیات جنہیں خواتمِ سُوَر کہتے ہیں' بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ فواتح و خواتم آپ کو اکثر و بیشتر سورتوں میں ملیں گے۔ ابتدائی آیات بڑی اہم ہیں' بڑی پُر جلال' بڑی جامع' لوگوں کی توجہ کو کھینچ لینے والی اور اختتام پر بھی بڑی جامع باتیں آگئیں۔ اس طرح اگرچہ طویل سورتوں میں مضامین بے شمار آجاتے ہیں' لیکن آخر میں جو اصل نکتہ ہے اس پر لا کر بات کو مرکوز کر دیا جاتا ہے۔

قرآن مجید کی ترکیب و تقسیم

قرآن مجید کے تعارف کے حوالے سے یہ بہت ہی اہم حصہ ہے۔ اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ترکیب کیا ہوتی ہے اور پھر یہ کہ قرآن کی ترکیب کسے کہتے ہیں۔ مرکب شے وہ ہے جو کچھ اجزاء سے مل کر بنی ہے۔ مفرد اور مرکب میں فرق ہے۔ اب دیکھئے کہ قرآن کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔ اس لئے کہ آپ کو معلوم ہے کہ کلام کلمات سے بنتا ہے۔ اسم' فعل' حرف' یہ سب کلمات کہلاتے ہیں۔ ان کلمات کو جوڑ کر آپ کلام بناتے ہیں۔ اس حوالے سے قرآن مجید کا ابتدائی یونٹ "آیت" ہے اور آیتیں سورتوں کی شکل میں جمع ہیں۔ اس کی صرف یہی دو بنیادی اصطلاحات ہیں۔ آیت جملہ نہیں ہے۔ آیت کو ہم شعر بھی نہیں کہہ سکتے۔ بدقسمتی سے انگریزی میں ترجمہ کرتے ہیں تو اس کے لئے Verse ہی کا لفظ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ آیت کے لئے آپ کوئی دوسری اصطلاح استعمال کر بھی لیں تب بھی آیت کا مفہوم وہی رہے گا جو ہے' آیت Verse نہیں کہلائے گی۔

© rasailojaraid
© rasailojaraid
© rasailojaraid

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آیت کے لفظی معنی کیا ہیں؟ آیت کے لفظی معنی "نشانی" کے ہیں۔ گویا قرآن مجید کی ہر آیت اللہ کے علم و حکمت کی ایک نشانی ہے۔ یہ اللہ کے کمالِ علم' کمالِ حکمت کی نشانیاں ہیں۔ جیسے کہ آیات آفاقی ہیں۔ آسمان' زمین' سورج' چاند' رات' دن' یہ سب کیا ہیں؟ یہ اللہ کی آیات ہیں ﴿اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ﴾ یہ سب آفاقی آیات ہیں۔ اسی طریقے سے قرآن مجید کی ابتدائی اکائی آیت ہے۔ یہ آیات صرف حروف پر بھی مشتمل ہیں جیسے "الٓمّٓ" یہ حروفِ مقطعات کہلاتے ہیں لیکن آیت تو ہو گئی۔ آیت مرکبات ناقصہ پر بھی مشتمل ہے' جیسے "وَالۡعَصۡرِ" اب اسے گرائمر کی رو سے مرکب ناقص کہیں گے' اس لئے کہ بات پوری نہیں ہوئی۔ "وَالۡعَصۡرِ" زمانے کی قسم ہے! سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس بات پر قسم ہے؟ جب تک آپ یہ نہیں بتائیں گے کہ کس چیز پر قسم کھا رہے ہیں تو بات کچھ بھی نہیں ہوئی۔ جملہ اس کو کہتے ہیں جس میں کہ بات مکمل ہو گئی ہو۔ یہ جملہ نہیں ہے' اس لئے کہ یہ کلام مفید نہیں ہے۔ لیکن قرآن مجید کی ایسی آیتیں بے شمار ہیں جو مرکبات ناقصہ ہیں۔ تیسرے یہ کہ ایک جملے پر بھی آیت ہو سکتی ہے۔ جیسے "اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ" یہ ایک مکمل جملہ ہے' اور ایسی آیتیں بھی ہیں جن میں دس دس جملے ہیں۔ آیت الکرسی ذرا پڑھئے تو اس میں سے دس جملے نکل آئیں گے۔ اس بات کو اچھی طرح نوٹ کر لیجئے کہ آیت کو ہمیشہ آیت ہی کہنا چاہئے۔ اس کے لئے ہمیں کسی زبان کا کوئی متبادل اختیار نہیں کرنا چاہئے۔

یہاں ایک اور سوال ذہن میں یہ آتا ہے کہ اس بات کا فیصلہ کون کرے گا کہ یہ آیت ہے۔ جان لیجئے کہ یہ توقیفی امر ہے۔ یہ حضور ﷺ کے بتانے سے پتہ چلا ہے کہ "وَالۡعَصۡرِ" ایک آیت ہو گئی ہے' "الٓمّٓ" ایک آیت ہو گئی ہے' جبکہ "الٓرٰ" آیت نہیں ہوئی۔ اس کی دلیل کیا ہے؟ وہی تین حروفِ مقطعات ہیں۔ عقل کہتی ہے آیت ہونی چاہئے۔ لیکن یہاں نہ تو گرائمر کا اصول ہے' نہ منطق کا اصول ہے' نہ کوئی اور آپ کا اصول اس میں کارگر ہو گا۔ یہاں صرف یہ بات چلے گی کہ محمد ﷺ نے کیا فرمایا ہے۔ اس کے لئے "توقیفی امر" کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ توقیفی امور موقوف علیہ ہیں

© rasailojaraid.c

حضور ﷺ کے بتانے پر۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ حضورؐ کی طرف دو روایات منسوب ہیں تو ان کی بنیاد پر دو آراء ہو سکتی ہیں۔ کوئی شخص اپنی دلیل سے 'اپنے استدلال سے طے نہیں کر سکتا کہ یہ آیت ہے۔ صرف حضورؐ کے بتانے سے طے ہو گا کہ یہ آیت ہے۔

آیات کی تعداد؟ : قرآن مجید کی آیات کی تعداد میں اختلاف ہے۔ اس کی چھ ہزار سے کچھ اوپر آیات ہیں۔ بعض حضرات چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ (۶۶۶۶) بھی کہتے ہیں۔ بعض چھ ہزار اور ڈھائی تین سو بھی کہتے ہیں۔ اس تعداد میں بڑے بڑے فرق اس وجہ سے بھی ہو گئے ہیں کہ ایک سو تیرہ مرتبہ آیتِ "بسم اللہ" آتی ہے جبکہ اس میں اختلاف ہے کہ آیت "بسم اللہ" کو ہر مرتبہ گنا جائے یا نہ گنا جائے۔ اگر یہ ایک آیت ہے تو گویا کہ ایک سو تیرہ کی تعداد کم ہو گئی۔ ایک مرتبہ تو یہ ایک سورۃ کے اندر بھی موجود ہے' حضرت سلیمان علیہ السلام نے جو خط ملکہ سبا کو لکھا تھا اس کا آغاز یوں ہوا : ﴿اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ اس سورۃ کے علاوہ یہ ایک سو تیرہ سورتوں سے پہلے بھی موجود ہے۔ ہر مرتبہ شمار کریں گے تو ایک سو تیرہ کا عدد بڑھ جائے گا للذا آیاتِ قرآنیہ کی تعداد متفق علیہ نہیں ہے۔ البتہ ذہن میں اندازہ رکھئے کہ یہ تعداد چھ ہزار سے کچھ اوپر ہے۔

سورۃ کسے کہتے ہیں؟ : اب ہم یہ دیکھیں گے کہ سورۃ کسے کہتے ہیں۔ سورۃ کا لفظ "سُور" سے بنا ہے اور اس کے معنی فصیل کے ہیں۔ یہ لفظ قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔ سورۃ حدید میں آتا ہے ﴿فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۭ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ﴾ پرانے زمانے میں یہ ہوتا تھا کہ ہر شہر کے گرداگرد ایک فصیل ہوتی تھی' جو اس کی حفاظت کرتی تھی۔ اب اس فصیل کے اندر جو شہر ہے' اس کی Lay out ہے' اس کا گراؤنڈ ہے' یا کوئی مارکیٹ کی جگہ ہے' اس کے مختلف محلے ہیں' فصیل اس سب کی حفاظت کر رہی ہے۔ تو قرآن مجید میں آیات کو ان سورتوں کی شکل میں جمع کر دیا گیا ہے۔ گویا کہ ہر سورۃ ایک شہر بن گیا ہے۔ یعنی معانی اور علم و حکمت کا ایک شہر۔ اس شہر کا اپنا ایک نظام اور لے آؤٹ ہے' اس کا اپنا نقشہ ہے۔

© rasailojaraid.c

اب اس میں بھی آپ دیکھیں گے کہ سورتیں بھی حضور ﷺ کی بتائی ہوئی ہیں۔ الحمدللہ کہ سورتوں کے بارے میں امت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ قرآن مجید کی کُل ایک سو چودہ سورتیں ہیں۔ سورتیں چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی ہیں۔ کم از کم تین آیتوں کی بھی سورتیں ہیں اور ایسی چھوٹی سورتوں کی تعداد بھی تین ہی ہے۔ یہ سورۃ الکوثر' سورۃ النصر اور سورۃ العصر ہیں۔ اس کے بالکل برعکس سورۂ بقرہ بھی ہے جو ۲۸۶ آیات پر مشتمل ہے۔ پھر یہ کہ اس میں ایک ایک آیت دس دس جملوں پر بھی مشتمل ہے' مثلاً "آیت الکرسی"۔ اسی طرح "آیت البِر" بھی بہت طویل آیت ہے۔ آخری پارے کی کئی سورتیں حجم میں "آیت الکرسی" سے کم ہیں۔ سورتوں کی تعداد اور ترتیب بھی توقیفی امر ہے۔

سورتوں کے علاوہ دورِ نبوی اور دورِ صحابہؓ میں ہمیں ایک اور لفظ ملتا ہے اور وہ "حِزب" یا "منزل" ہے۔ سورتوں کی یہ گروپنگ اس اعتبار سے ہے کہ اگر ہر ہفتے کوئی شخص قرآن مجید ختم کرنا چاہتا ہو تو اس کے لئے قرآن کو سات حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عموماً قرآن حکیم کی تلاوت رات کو نوافل میں ہی کھڑے ہو کر کرتے تھے۔ اس لئے کہ دن کے اوقات میں محنت و مشقت سے ہی فرصت نہیں ہوتی تھی۔ تو اصل میں قرآن پڑھنے کا وقت رات کا ہے۔ تلاوت کی ایک مقررہ مقدار ہر شخص کا معمول تھا۔ کسی شخص کا معمول ہے کہ رات کو اتنا قرآن پڑھنا ہے' کسی روز اس پر نیند کا ایسا غلبہ ہو گیا کہ نہیں پڑھ سکا تو وہ اسے دن میں مکمل کر لیتا۔ یہ حضورؐ نے تاکید فرمائی تھی۔ یعنی کسی کا جو بھی نصاب ہے' اگر کسی وجہ سے وہ رات کو نہ پڑھ سکے تو دن میں پورا کر لے۔ گویا کہ عہدِ نبوی میں "حزب" کا لفظ موجود تھا۔ اسی طریقے سے "منزل" کا لفظ موجود تھا۔ ان منزلوں کے اندر جو دو خوبیاں ہیں ان کو ذہن میں رکھئے۔ یہاں یہ نہیں کیا گیا کہ صفحے گن کر برابر برابر تقسیم کر بیٹھے' یہ تو بدذوقی کی بات ہے۔ بلکہ اس تقسیم میں سورتیں مکمل لی گئی ہیں چاہے کوئی حصہ زیادہ بڑا بھی ہو جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ پہلی منزل پونے پانچ پارے کی ہے۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ایسی صورت پیدا ہو گئی ہے کہ عددی اعتبار سے پہلی منزل میں تین سورتیں ہیں۔ سورۂ فاتحہ کو چھوڑ دیجئے' اس لئے کہ یہ پورے قرآن کا دیباچہ و مقدمہ ہے۔ پہلی منزل میں سورۃ البقرہ' سورۂ آل عمران اور سورۃ النساء

© rasailojaraid.co
© rasailojaraid.co

ہیں۔ اگلی منزل میں پانچ سورتیں ہیں۔ پھر اگلی منزل میں سات سورتیں ہیں۔ اس سے اگلی میں نو سورتیں ہیں۔ اس سے اگلی میں گیارہ سورتیں ہیں۔ اس سے اگلی میں تیرہ سورتیں ہیں۔ اور ساتواں حزب جو "حزبِ مفصّل" کہلاتا ہے اس میں ۶۵ سورتیں ہیں۔ اس لئے کہ ۳۵ سورتیں تو آخری پارے میں ہی ہیں۔ لیکن وہ بھی تیرہ اور پانچ کا حاصل ضرب (یعنی ۶۵) ہے۔ اس طرح ایک عددی حسن پیدا ہو گیا ہے' ان دونوں خوبیوں کی طرف بھی توجہ دینی چاہئے۔ ایک یہ کہ ان منزلوں یا احزاب میں سورتوں کی فصیل نہیں ٹوٹتی۔ دوسری بات یہ کہ اس میں ایک بڑی اچھی ترتیب میں سورتوں کی تعداد بڑھتی ہے۔

پاروں اور رکوعوں کی تقسیم : قرآن کے مذکورہ بالا اجزائے ترکیبی دورِ صحابہ میں موجود تھے جبکہ ان کا اضافہ بعد میں ہوا ہے۔ ایک اضافہ تو حجاج بن یوسف کے دور میں ہوا ہے اور ایک غالباً اس کے بھی بعد۔ حجاج بن یوسف نے ایک تو قرآن مجید پر نقطے لگوائے اور زبر زیر وغیرہ علامات لگوائیں۔ ورنہ اس سے پہلے قرآن مجید میں نہ نقطے تھے' نہ ہی رموزِ اوقاف تھے' نہ ہی زیر زبر تھے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ پرانے زمانے میں جو بڑا قسم کا منشی ہوتا تھا' جب وہ خط شکستہ میں لکھتا تھا تو وہ نقطے نہیں لگاتا تھا' بلکہ اگر کسی پڑھے لکھے آدمی کو نقطے لگا کر تحریر بھیج دی جاتی تو وہ اسے اپنی توہین سمجھتا تھا کہ مجھے جاہل سمجھا ہے کہ نقطے بھی لگائے ہیں' کیا میں بغیر نقطے کے عبارت کو سمجھ نہیں سکتا؟ عرب چونکہ صاحبِ لسان تھے' لہٰذا انہیں نقطوں کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور قرآن مجید تو چونکہ اصل میں زبان سے زبان تک منتقل ہوا ہے' پڑھنے کے ذریعے سے' تو شروع میں جو مصحف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں تیار ہوئے ہیں ان میں بھی نقطے نہیں ہیں۔ نقطوں اور حرکات کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب غیرِ عرب لوگ اسلام میں داخل ہو رہے تھے' ان کو قرآن سمجھنے کے لئے حرکات اور نقطوں کی ضرورت تھی۔ عربی عربوں کی تو اپنی زبان تھی لہٰذا انہیں نقطوں اور حرکات کی احتیاج نہیں تھی۔

حجاج بن یوسف نے دوسرا کام رکوعوں کی تقسیم کا کیا۔ بڑی سورتوں کو اس نے رکوعوں میں تقسیم کروایا۔ یہ رکوع بنا ہے "رکعت" سے۔ اب سورۂ بقرہ ایک رکعت میں

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

تو نہیں پڑھی جا سکتی لہٰذا اس کے لئے رکوع بنائے گئے تاکہ ایک قاری اور نمازی جتنا حصہ پڑھے وہ بامعنی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ ایسی جگہ رکے جہاں مضمون ادھورا رہ گیا ہو' بات نامکمل رہ جائے۔ گویا کہ مضمون کے اعتبار سے ایسے حصے بنا دیئے جائیں کہ ہر رکعت میں اتنا حصہ پڑھ لیا جائے تو معنی برقرار رہیں۔ رکوعوں کی تقسیم میں اکثر و بیشتر مضامین کا خیال رکھا گیا ہے۔ یہ تقسیم چونکہ حضور ﷺ کے زمانے میں نہیں تھی لہٰذا اس کے بارے میں اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ عرب ممالک میں جو قرآن چھپتے ہیں ان میں رکوع نہیں ہیں۔ انہوں نے "حزب" کے نام سے ایک اور تقسیم شروع کر دی ہے۔ وہاں رکوعوں کی تقسیم ہی نہیں ہے تو کوئی حرج نہیں ہے' اس لئے کہ یہ خود حضور ﷺ کے زمانے میں بھی نہیں تھی۔ اس میں بہرحال اختلاف کی گنجائش ہے۔ لہٰذا کوئی کہہ سکتا ہے کہ رکوع یہاں ختم نہ ہوتا بلکہ یہاں ہوتا تو بہتر تھا۔ لیکن میں نے جتنا غور کیا ہے شاذ ہی کچھ مقامات ایسے ہیں کہ جہاں محسوس ہوتا ہے کہ وہاں رکوع کی جو تقسیم ہے اس میں improvement کی گنجائش موجود ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ مضمون اور مفہوم کے اعتبار سے وہاں ایک حصہ مکمل ہو جاتا ہے۔

اس تقسیم کی حد تک جو بات ہوئی ہے وہ خوبصورتی کے ساتھ ہوئی ہے۔ اس کے آگے چل کر قرآن کے جو تیس پارے بنائے گئے ہیں' یہ بڑے بھونڈے انداز میں بنائے گئے ہیں۔ یہ کسی ایسے شخص نے بنائے ہیں جس نے قرآن کو برابر برابر تیس حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ نہیں دیکھا کہ سورۃ کی فصیل ٹوٹ رہی ہے! چنانچہ آپ کو معلوم ہے کہ سورۂ حجر کی ایک آیت تیرھویں پارے میں ہے جبکہ باقی ساری سورۃ چودھویں پارے میں ہے۔ سورتوں کو توڑنے کی ایسی ایسی شکلیں اچھی نہیں ہیں اور یہ انداز گراں گزرتا ہے۔

پاروں کی یہ تقسیم کیوں وجود میں آئی؟ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب مسلمانوں کا جوش دینی و ایمانی کم پڑ گیا تو ہر مہینے میں ایک دفعہ ختم قرآن کی غرض سے قرآن کو تیس حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ہفتے میں قرآن ختم کرنا مشکل ہو گیا تو یہ تقسیم وجود میں آئی۔ بہرحال یہ پاروں میں قرآن کی بڑی بھونڈی تقسیم ہے۔ یہ بات میں بلا جھجک کہہ رہا ہوں۔ اس لئے کہ حضورؐ اور صحابہ کے زمانے کی بات نہیں ہے بلکہ یہ تو حجاج بن یوسف

© rasailojaraid

کے بھی بہت بعد کے زمانے کی بات ہے۔

ترتیب و تدوینِ قرآن

پہلی بات جو قرآن مجید کی ترتیب و تدوین کے ضمن میں متفق علیہ ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کی ترتیبِ نزولی اور تھی اور ترتیبِ مصحف کچھ اور ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن میں مکی سورتیں اور مدنی سورتیں آپس میں ملی ہوئی ہیں۔ ترتیب نزولی تو یہ ہونی چاہئے کہ پہلے ساری مکی سورتیں آئیں۔ مگر ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ جو پہلی وحی ہے وہ شروع میں نہیں ہے بلکہ شروع میں سورۂ فاتحہ ہے۔ اس حوالے سے اس میں تو کوئی اختلاف ہے ہی نہیں۔ یہ اجماعی بات ہے کہ قرآن کی جو ترتیب مصحف ہے' وہ ترتیبِ نزولی سے مختلف ہے۔

اہل تشیع کے حوالے سے جو بات میں نے کہی تھی کہ وہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے ترتیبِ نزولی سے قرآن جمع کیا تھا تو میں یہ بات تسلیم کرنے کو تیار ہوں کہ حضرت علیؓ نے کوئی قرآن ترتیبِ نزولی پر مرتّب کیا ہو۔ یہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں ہے۔ یہ تو فہمِ قرآن اور تدبرِ قرآن کی ایک کوشش ہو سکتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کے بعض انگریزی مترجمین نے بھی یہ کیا ہے کہ سورتوں کی ترتیب بدل دی ہے اور انہوں نے نزولی ترتیب میں' جو بھی انہیں سمجھ میں آئی ہے' قرآن کو مرتب کیا ہے' تاکہ ایک قاری کو سہولت ہو جائے کہ پہلے مکی سورتیں پڑھ لے اور اسے پتہ چلے کہ پہلے یہ مضامین آئے ہیں' پھر یہ مضامین۔ قرآن حکیم کے نزول کے اعتبار سے تیرہ سال مکی ہیں جنہیں تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی پہلے چار سال' درمیانی چار سال اور آخری چار سال۔ ظاہر بات ہے کہ ان تینوں ادوار کے مزاج میں حالات کی تبدیلی کی وجہ سے فرق ہے۔ چونکہ قرآن حالات و ضرورت کے مطابق نازل ہو رہا تھا تو ان کے مضامین میں فرق واقع ہوتا چلا جائے گا۔ اس اعتبار سے حضرت علیؓ نے اپنے فہمِ قرآن' تدبرِ قرآن اور قرآن مجید پر غور و فکر کے لئے کوئی نسخہ ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے بھی مرتب کر لیا ہو تو یہ کوئی گناہ کی بات نہیں ہے اور نہ اس میں کوئی غلط بات ہے۔ لیکن قرآن کی اصل ترتیب ترتیبِ مصحف ہے اور یہی وہ ترتیب ہے

© rasailojaraid
© rasailojaraid
© rasailojaraid

جس پر محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے مصحف کو مرتب فرمایا ہے۔ اب اہل تشیع سب کے سب تو نہیں' بہرحال ان میں کچھ لوگ ہیں کہ جو کہتے ہیں کہ اصل قرآن تو وہی ہے کہ جو حضرت علیؓ نے مرتب کیا تھا۔ اسی لئے اس کو "مصحفِ عثمان" کہتے ہیں۔ وہ "قرآن" تو کہتے ہی نہیں ہیں۔ اس لئے کہ اس پر لفظ "قرآن" کا اطلاق وہ اپنے عقیدے کی رو سے صحیح نہیں سمجھتے۔ اس لحاظ سے مصحفِ عثمان کا لفظ آپ کو زیادہ تر اہل تشیع کی زبان اور قلم پر ملے گا۔ ویسے اس لفظ کے استعمال کرنے میں غلطی بھی نہیں ہے۔ "مصحفِ عثمان" کی یہ اصطلاح اپنی جگہ پر صحیح ہے' لیکن وہ اسے جو استعمال کرتے ہیں تو دراصل اس غلط نظریئے کی وجہ سے استعمال کرتے ہیں۔ بہرحال جو اس کی موجودہ ترتیب ہے وہ وہی ہے جو لوح محفوظ کی ترتیب ہے۔ یہی ہے جو "کتاب مکنون" کی ترتیب ہے۔ اور یہی ہے کہ جس پر محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے اس کو مرتب کیا ہے۔

تدوینِ قرآن کے مراحل : اس کی تدوین کے تین مراحل ہیں۔ یہ بات البتہ علمی طور پر سمجھ لینا چاہئے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں قرآن مرتب ہو گیا تھا۔ سورتیں مکمل ہو گئی تھیں' سورتوں کی ترتیب معین ہو گئی تھی' لیکن کتابی شکل میں کوئی حصہ مکمل موجود نہیں تھا۔ جو حقائق ہیں وہ ہم مانتے ہیں' اس لئے کہ بنیادی طور پر قرآن زبان سے زبان تک منتقل ہوا۔ حضورؐ نے پڑھا' صحابہؓ نے سنا اور یاد کر لیا۔ اب قاری حضرات ہیں جو اس کو آگے پھیلا رہے ہیں۔ اسی مقصد کے لئے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو حضورؐ نے مدینہ منورہ بھیجا تھا' جہاں ان کا نام ہی "مقری" پڑ گیا تھا یعنی پڑھانے والا۔ قاری کے معنی ہیں پڑھنے والا' اور اسی سے باب افعال میں اسم فاعل بنے گا "مقری" یعنی پڑھانے والا۔ تو جو ہمارے ہاں قراءت کا فن ہے یہ سارا درحقیقت سماعت کے ذریعے سے وجود میں آیا ہے۔ استاد پڑھتا ہے اور شاگرد سنتا ہے۔ اس کے ذریعے سے درحقیقت وہ قرآن کی تعلیم حاصل کرتا ہے۔ بہرحال حضور ﷺ کے زمانے تک سورتوں کی ترتیب مکمل ہو چکی تھی۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ کوئی آیت اتری تو حضورؐ نے فرمایا کہ اسے فلاں سورۃ میں فلاں آیت کے بعد درج کر لو یا یاد کرو۔ تو گویا کہ سورتوں کی تکمیل و تدوین حضورؐ کے زمانے میں ہو چکی تھی۔ اسی لئے صحیح حدیث کی رو سے ہر رمضان المبارک میں حضرت جبرئیلؑ آتے تھے

© rasailojaraid.com

اور حضورؐ ان کے ساتھ قرآن کا دورہ کرتے تھے۔ ظاہر ہے یہ دور اسی حصے کا ہوتا تھا جو اس وقت تک نازل ہو چکا ہوتا تھا۔ رمضان المبارک میں دورہ کا معمول ایک مسنون عمل ہے۔ آج کل بھی جب رمضان آتا ہے تو قاری حضرات قرآن کا دورہ کرتے ہیں' اسے تازہ کرتے ہیں۔ رمضان المبارک میں حضورؐ اور حضرت جبرائیل دورہ کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ کو سکھانے والے کون تھے؟ حضرت جبرائیلؑ تھے۔ ان سے سنا ہے اور حضورؐ نے اس کو اخذ کیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ حضورؐ جو دورہ فرماتے تھے وہ ترتیب کے بغیر تو نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کا جو آخری رمضان مبارک تھا' اس میں آپ نے دو مرتبہ قرآن کا دورہ مکمل کیا تھا۔

چنانچہ سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے قرآن کی تدوین آپ کے زمانے میں آپؐ ہی کے حکم سے' آپؐ ہی کی منشاء کے مطابق مکمل ہو چکی تھی۔ البتہ اس میں ایک کمی تھی' اور وہ کمی یہ تھی کہ کوئی ایک نسخہ کتاب کی شکل میں' مجلد شکل میں حضورؐ کے زمانے میں نہیں تھا۔ اس کی ضرورت کا احساس تب ہوا جبکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جنگیں شروع ہوئی ہیں۔ مسیلمہ کذاب کی بڑی قوت جمع ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ جو جنگ ہوئی جسے جنگِ یمامہ کہا جاتا ہے' اس میں چھ سو حفاظ شہید ہو گئے تھے۔ اس موقع پر تشویش پیدا ہو گئی کہ اگر قرآن کو لکھی ہوئی شکل میں' کتابی صورت میں محفوظ نہ کر لیا گیا تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ یہ قرآن کہیں گم نہ ہو جائے۔ لہٰذا ایک تجویز پیش ہوئی کہ قرآن کو اب کتاب کی شکل میں بھی جمع کر لیا جائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کافی دیر تک یہ بات مانی ہی نہیں۔ ان کی دلیل کیا تھی؟ انہوں نے کہا کہ یہ کام حضورؐ نے نہیں کیا' میں کیسے کروں؟ یہ تو حضورؐ کی اتباع کا جذبہ تھا' جیسے کہ انہوں نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ اگر یہ منکرینِ زکوٰۃ حضورؐ کے زمانے میں زکوٰۃ کے اونٹوں کے ساتھ باندھنے والی رسیاں بھی دے دیتے تھے اور آج کہیں کہ اونٹ لے جاؤ رسیاں دے جاؤ' تب بھی میں ان کے خلاف جنگ کروں گا۔ اس لئے کہ دین میں اس درجہ کی ترمیم بھی مجھے گوارا نہیں ہے۔ انہوں نے کہا تھا : "أَيُبَدَّلُ الدِّيْنُ وَأَنَا حَيٌّ؟" یعنی "کیا دین میں تبدیلی کر دی جائے گی جبکہ میں ابھی زندہ ہوں"۔ اسی طرح قرآن کو کتابی شکل میں مدوّن کرنے کے معاملے میں

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

بھی ابوبکرؓ پریشان تھے' لیکن اس کام کے حق میں دلائل اتنے قوی تھے کہ سب صحابہ کا اس بات پر اجماع ہو گیا۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے ان کی بات مان لی۔ پھر جو حضورؐ کے زمانے میں کاتبینِ وحی تھے 'زیدؓ' بن ثابتؓ' حضرت علیؓ' حضرت معاویہؓ' یہ وہ لوگ ہیں جو حضورؐ کے سیکریٹریز تھے۔ حضورؐ تو دنیاوی اعتبار سے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ آپؐ "اُمّی" تھے اور یہ حضرات آپؐ کے سیکریٹریز کاتبینِ وحی تھے۔ جب بھی کوئی آیات نازل ہوتی تھیں تو یہ حضرات حضورؐ کے حکم سے لکھ لیا کرتے تھے۔ ان حضرات کا ایک بورڈ بنایا گیا' اور زیدؓ بن ثابت ان کے چیف بنائے گئے۔ انہوں نے پھر اس کو کتاب کی شکل میں یعنی "ما بَینَ الدَّفَّتَین" مدون کیا۔ "دُفّۃ" کہتے ہیں گتے کو' جیسے دو گتوں کے اندر کتاب آجاتی ہے۔ گویا باقاعدہ کتابی صورت میں قرآن کی تدوین حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں ہوئی۔ اس سے پہلے قرآن مجید اس شکل میں موجود نہیں تھا۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ کتابی صورت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں تدوین ہوئی جو عہدِ نبوت سے بالکل متصل ہے۔ ایسا نہیں ہوا کہ سینکڑوں سال بیت گئے ہوں۔

اب ہم قرآن حکیم کی تدوین کے تیسرے مرحلے کی طرف آتے ہیں۔ قرآن کو پڑھنے کے ضمن میں حضورؐ نے ایک آزادی دی تھی۔ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ مختلف علاقوں کے مختلف لہجے ہوتے ہیں۔ ایک ہی لفظ ہے' اس کو کوئی شخص کسی اور طریقے سے ادا کرتا ہے جبکہ کوئی دوسرا شخص کسی اور طور سے۔ حضورؐ نے شروع میں اس بات کی اجازت دی تھی کہ ہر شخص اپنے لہجے کے مطابق قرآن پڑھ سکتا ہے۔ مثلاً ایک لفظ کی مثال بہت سادہ ہے۔ دیہات میں کچھ لوگ "چاقو" کو "قاچو" کہتے ہیں۔ حضورؐ کی اس اجازت کا نتیجہ کیا نکلا؟ اب لوگ لکھنے میں بھی وہی لہجہ اپنانے لگے۔ ظاہر ہے کہ جب آپ "چاقو" کو "قاچو" یا "کاچو" لکھیں گے تو بڑا فرق واقع ہو جائے گا۔ اس حوالے سے جب لوگوں میں یہ فرق ہونے لگا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں اب ایک متفق علیہ "ٹیکسٹ" تیار کیا گیا۔ یہ تدوین قرآن کا تیسرا مرحلہ ہے۔

کیا حضرت عثمان جامع القرآن ہیں؟ : بدقسمتی سے ہمارے ہاں خطبے میں خطیب حضرات قافیہ ملانے کے لئے حضرت عثمان کے نامِ گرامی کے ساتھ "جامع القرآن عثمانؓ بن

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

عفان" کے الفاظ کہہ دیتے ہیں۔ آپ سوچیں کہ "جامعُ القرآن" کا ترجمہ ہوتا ہے "قرآن کو جمع کرنے والا"۔ اب گویا کہ ہم خود ان الفاظ کے ذریعے سے ہر سننے والے کے ذہن میں یہ وسوسہ پیدا کر رہے ہیں کہ حضرت عثمانؓ سے پہلے کے زمانے میں شاید قرآن جمع ہی نہیں ہوا۔ حضرت عثمانؓ کا زمانۂ خلافت حضورؐ کے عہدِ مبارک کے تقریباً بارہ برس بعد کا ہے۔ پھر بارہ برس ان کے دورِ خلافت کا طویل عرصہ ہے۔ اگر اس کے درمیانی چھ برس بھی لے لئے جائیں تو اندازہ ہوا کہ حضورؐ کے بیس برس کے بعد قرآن جمع ہو رہا ہے۔ اب یہ وسوسہ ذہن میں بیٹھ جائے گا تو بڑے شکوک و شبہات پیدا ہوں گے۔ ظاہر بات ہے کہ بیس برس میں تو کافی چیزیں گم بھی ہو سکتی ہیں۔ یہ تو خاصا لمبا عرصہ ہے۔ بقول شاعر ع ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں۔ حضرت عثمانؓ اصل میں "جامعُ الامۃِ علی القرآن" ہیں۔ یعنی امت کو ایک رسم الخط پر جمع کرنے والے۔ آپؓ کے دورِ خلافت میں قرآن کا ایک متفق علیہ مسودہ (SCRIPT) تیار کیا گیا کہ اب قرآن اس طریقے سے لکھا جائے گا۔ اس لئے اس کو "مصحفِ عثمانؓ" کہتے ہیں اور اس کے خط کو "رسمِ عثمانی" کہتے ہیں۔ آج قرآن رسم عثمانی پر ہے۔ میں آپ کو اس کی ایک مثال بتا دیتا ہوں۔ رسم عثمانی کے مطابق سورۂ فاتحہ میں "ملک یوم الدین" ہے' اگر ہم ا سے "مالک" لکھیں گے تو یہ غلط ہو گا۔ حضرت عثمانؓ کے نسخے میں "ملک" لکھا ہوا ہے یعنی میم پر کھڑا زبر ہے' میم کے بعد الف نہیں ہے۔ چونکہ قراءتیں دو ہیں "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" بھی ہے اور "مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" بھی ہے۔ لہٰذا جب آپ اس طور سے لکھیں گے "ملک" تو یہ "مٰلِكِ" بھی پڑھا جا سکتا ہے اور "مَلِكِ" بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر "مالک" کر دیں گے تو "مَلِكِ" پڑھنے کا کوئی امکان ہی نہیں رہا' اس کا تلفظ صرف "مَالِكِ" ہی رہ جائے گا۔ اس اعتبار سے اس رسم الخط کو پورے طور سے Follow کرنا بہت ضروری ہے۔ درحقیقت حضرت عثمانؓ نے جو خدمتِ قرآن فرمائی اس کے اعتبار سے آپ "جامعُ آیاتِ القرآن" نہیں ہیں بلکہ "جامع الامۃ علی الرسم الواحد" ہیں۔ یعنی ایک رسم الخط پر پوری امت کو حضرت عثمانؓ نے جمع کیا ہے۔ اس کے لئے ایک کمیٹی بنی' انہوں نے قرآن مجید کا ٹیکسٹ لکھا' پھر اس کی نقول تیار

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

کی گئیں، اس کے چھ سات نسخے تیار کروائے گئے۔ ایک نسخہ مدینہ منورہ میں تھا۔ ایک نسخہ مکہ مکرمہ بھیج دیا گیا، ایک دمشق گیا، ایک کوفہ گیا، ایک بحرین گیا، ایک یمن گیا اور ایک بصرہ گیا۔ گویا کہ مختلف علاقوں میں یہ نسخے لے جائے گئے۔ ان میں سے ایک نسخہ تاشقند میں تھا۔ انہی میں سے ایک نسخہ استنبول میں ہے۔ ایک نسخہ حضرت عثمان نے اپنے پاس رکھا تھا۔ وہ اس پر تلاوت فرمارہے تھے جب ان کو شہید کیا گیا، لہٰذا اس نسخے پر ان کے خون کا دھبہ آج تک موجود ہے۔ پہلے پارے کے آخری رکوع میں فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ کے الفاظ پر حضرت عثمانؓ کے خون کا دھبہ لگا ہوا ہے۔

<u>دورِ حاضر میں قرآنی خدمات</u> : ہمارے ہاں جب مختلف کاروباری اداروں نے قرآن حکیم شائع کرنا شروع کیے تو ان میں رسم الخط کی بڑی غلطیاں تھیں۔ اس لئے حکومت نے ہمارے ہاں یہ قانون بنایا ہوا ہے کہ کوئی شخص یا ادارہ قرآن شائع نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ معین تصحیح کرنے والے اشخاص کا سرٹیفکیٹ نہ حاصل کرے۔ اس حوالے سے اس دور میں سب سے بڑی خدمت سعودی عرب کی ہے کہ انہوں نے لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں رسم عثمانی کا مصحف شائع کیا ہے اور اس کو دنیا بھر میں تقسیم کیا ہے۔ ایک زمانے میں وہ ہر حاجی کو قرآن مجید دے رہے تھے، بہت دبیز آرٹ پیپر پر دیدہ زیب طباعت اور بہت عمدہ جلد کے ساتھ۔ تو یہ کام ہے جو اس دور میں ہوا ہے۔ یہ قرآن کی بہت بڑی خدمت ہے۔

ایک خدمت وہ بھی تھی کہ جو مصر کے صدر ناصر کے حصے میں آئی تھی۔ جب اسرائیل نیا نیا قائم ہوا تھا تو یہودیوں نے قرآن مجید میں تحریف کی کوشش کی۔ لہٰذا انہوں نے اس کے کچھ غلط نسخے چھاپ کر بہت بڑی تعداد میں افریقہ کے ممالک میں پھیلا دیئے۔ اب ظاہر بات ہے کہ کسی کو وہ قرآن ملا تو وہ اس کو قرآن ہی سمجھ کے پڑھ رہا ہے، جبکہ اس میں کچھ اور لکھا ہوا ہے۔ سو سال بعد کسی کو ملے گا تو وہ سمجھے گا کہ یہی قرآن ہے، یا یہ کہ کم از کم اختلاف تو ہو جائے گا کہ سو سال پرانا قرآن ہے، اس میں تو یہ لکھا ہوا ہے!! یہ بہت بڑی سازش تھی۔ گویا کہ اب تک مسلمانوں کے پاس جو ایک بڑی قیمتی متاع موجود ہے کہ قرآن کے متن میں اختلاف کہیں نہیں ہے۔ آپ مشرقِ اقصیٰ سے کوئی نسخہ لے لیجئے اور مغربِ

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

اقصیٰ سے لے لیجئے، ٹیکسٹ میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔ یہ قرآن کا ایک بہت بڑا معجزہ ہے۔ اس کو ختم کرنے کے لئے انہوں نے سازش کی۔ اس وقت صدر ناصر نے اس کا توڑ یہ کیا تھا کہ پورے قرآن مجید کو ترتیل کی شکل میں دو قاریوں سے پڑھوایا اور اس کے کیسٹ تیار کر کے پوری دنیا میں پھیلا دیئے۔ وہ دو قاری، محمود خلیل الحصری اور عبدالباسط محمد عبدالصمد ہیں۔ یہ دونوں چوٹی کے قُرّاء تھے۔

بہرحال قرآن حکیم کی تدوین کے یہ تین مراحل ہیں۔ یہ کام عہدِ رسالت کے بہت ہی قریب میں مکمل ہو گیا تھا۔ اگر حضرت عثمانؓ کے بارہ سال بھی شامل کر لیں تو ایک ربع صدی کے اندر یہ تمام مراحل طے ہو چکے تھے۔ گویا کہ قرآن اپنی ترتیب و تدوین کے ساتھ زبانی اور سینوں میں حضور ﷺ کے عہدِ مبارک میں ہی جمع ہو چکا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں قرآن مجید "مابین الدفتین" یعنی کتابی صورت میں جمع ہو گیا۔ جبکہ ایک رسم الخط اور ایک ٹیکسٹ پر مسلمانوں کو جمع کرنے کا مرحلہ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مکمل ہوا۔

© rasailojaraid

حرفِ آخر

اب میں چند باتیں ابتداء میں تلاوت کی جانے والی آیات کے حوالے سے آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ سورۃ الواقعہ میں فرمایا: ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝﴾ "تو نہیں! میں قسم کھاتا ہوں ان جگہوں کی جہاں ستارے ڈوبتے ہیں"۔ "وقع" کے معنی پڑنا کے ہیں۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس وقت لوگوں نے "مواقع النجوم" سے کیا سمجھا ہو گا۔ اس کے کیا معنی و مراد ہیں، آج ہمیں معلوم ہے ایک "Black Hole" کا نظریہ ہے۔ آج کی سائنس بتا رہی ہے کہ اس کائنات کے اندر ایسے بلیک ہولز ہیں جہاں پوری کی پوری ارب ہا ارب میل لمبی کہکشائیں (Galaxies) ختم ہو کر، سکڑ کر ایک دھبہ بن کر رہ گئی ہیں۔ تو یہ "Black Holes" جو ہیں یہ "مواقع النجوم" ہیں۔ ﴿وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝﴾ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں: "اور یقیناً یہ قسم، اگر تم جانو تو بہت بڑی قسم ہے"۔ ان الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ

© rasailojaraid

وہ کیسے جان سکتے تھے۔ آج سے چودہ سو برس قبل کا انسان یہ کیسے جان سکتا تھا۔ بہرحال فرمایا کہ اگر تم جانو تو بہت بڑی قسم ہے جو میں کھا رہا ہوں۔ اب یہ قسم کھا کر فرمایا گیا ﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ○﴾ "یہ بہت ہی باعزت قرآن ہے"۔ ﴿فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ○﴾ اصل اس کی جو ہے وہ ایک ایسی کتاب میں ہے جو چھپی ہوئی ہے' وہ سامنے نہیں ہے۔ وہ تو "لوحِ محفوظ" ہے' وہ تو بہت بڑی کتاب ہے "ام الکتاب" ہے۔ آگے فرمایا ﴿لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ○﴾ "اس کو چھو ہی نہیں سکتے مگر وہ جو نہایت پاک ہیں"۔ وہ لوح محفوظ میں ہے اور اس کو چھونے والے تو فرشتے ہیں۔ اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ یہ قرآن جو معنوی طور پر تمہارے سامنے ہے اس تک بھی تطہیر اور تزکیہ کے بغیر تمہاری رسائی نہیں ہو سکے گی۔ الفاظ پڑھ لو گے لیکن مفہوم تک نہیں پہنچو گے' جب تک کہ تمہارے اندر طہارت پیدا نہ ہو جائے۔ جب تک تطہیر اور تزکیہ کا عمل نہ ہو جائے اس وقت تک قرآن کے حقیقی علوم و معارف تک تم نہیں پہنچ پاؤ گے۔ اسی سے یہ مفہوم بھی لیا گیا ہے کہ وضو کے بغیر اسے ہاتھ نہ لگایا جائے۔ گویا کہ ایک ہی آیت کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ اگلی آیت ہے ﴿تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○﴾ "اس ہستی کی طرف سے اس کو نازل کیا گیا ہے جو پروردگارِ عالم ہے"۔ آگے الفاظ ہیں ﴿اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ○﴾ تو کیا اس جیسی بات کے لئے تم سستی اور کسل کر رہے ہو"۔ باقی سب کچھ سمجھ کر پڑھتے ہو اور اسے بے سمجھے پڑھ رہے ہو۔ نامعلوم کتنی محنتیں کرتے ہو اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے کے لئے۔ یہاں تک کہ تم انہیں امریکہ بھیج دیتے ہو۔ لیکن قرآن پڑھانے کی طرف تمہاری کوئی توجہ نہیں ہے۔ یہ ہے تمہاری سستی اور کسل مندی کی انتہا۔ گویا یہ کسل مندی تمہاری ناقدری کی غماز ہے۔ ﴿وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ○﴾ "اور تم نے اپنا نصیب یہ بنا لیا ہے کہ تم جھٹلا رہے ہو"۔ اس کے دونوں معنی ہیں' اگر کفار سے خطاب ہے تو وہ جھٹلا رہے تھے کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے' اور اگر مسلمانوں سے خطاب ہے تو ہمارا جو طرز عمل ہے وہ جھٹلانے کے مترادف ہے۔ اگر قرآن کو ہم نہیں پڑھیں گے تو گویا کہ یہ اسے جھٹلانا ہے۔ قرآن پر عمل نہیں کریں گے تو گویا کہ جھٹلانا ہی ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ "مَا آمَنَ بِالْقُرْآنِ مَنِ اسْتَحَلَّ

(باقی صفحہ ۵۱ پر)

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com